شاہانِ آصفیہ کی رواداری
اور
ہندو مسلم روایات

حضرت غفران منزل میر فرخندہ علی خاں
ناصر الدولہ آصف جاہ رابع

حضرت مغفرت مکان میر تہنیت علی خاں
افضل الدولہ آصف جاہ خامس

حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں
آصف جاہ سادس

میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع

حضرت مغفرت مآب میر قمر الدین خاں
نظام الملک آصف جاہ اول

حضرت غفران مآب میر نظام علی خاں
نظام الدولہ نظام الملک آصف جاہ ثانی

حضرت مغفرت مآب میر اکبر علی خاں
فولاد جنگ سکندر جاہ آصف جاہ ثالث

ڈاکٹر شیلا راج

شاہانِ آصفیہ کی رواداری

اور

ہندو مسلم روایات

از

ڈاکٹر شیلا راج

کتاب	شاہان آصفیہ کی رواداری اور ہندو مسلم روایات
مصنفہ	ڈاکٹر شیلا راج
اشاعت	۲۰۰۷ء
ضخامت	۱۱۲ صفحات
قیمت	ایک سو روپے -/Rs.100
تعداد	۵۰۰
ناشر	ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، باغ عامہ، حیدرآباد
کمپیوٹر کتابت	جلال الدین اکبر 'اردو کمپیوٹر سنٹر' 17-1-182/101/1/2 بانو نگر، مادنا پیٹ، حیدرآباد ۵۹ (اے۔پی) فون 65410828 سل نمبرز 9848261465/9885180925
طباعت	اعجاز پرلیس، چھتہ بازار، حیدرآباد۔فون: 66711442, 65945267
ملنے کا پتہ :	ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، باغ عامہ، حیدرآباد

فہرست

انتساب		۵
پیش لفظ	جناب محمود بن محمد	۶
تعارف	ڈاکٹر اشرف رفیع	۱۱
دیباچہ	ڈاکٹر شیلا راج	۱۸
میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کی رواداری		۲۵
میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی رواداری		۵۳
شاہان آصفیہ اور ہندو مسلم روایات		۷۷

انتساب

شاہانِ آصفیہ، امراءورؤساءاور حیدرآبادیوں کے نام
جنہوں نے آنے والی نسلوں کے لیے یکجہتی، بھائی چارگی
اور رواداری کی بے نظیر مثال قائم کی۔

پیش لفظ

یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ حیدرآبادیوں کی نئی نسل کے بیشتر افراد آصف جاہی خاندان کی گرانقدر میراث اور روایات سے ناواقف ہیں۔ کئی اوہام ہیں جنھیں نوجوانوں کے ذہن سے نکال پھینکنا انتہائی ضروری ہے۔ کئی ان کہی کہانیاں ایسی ہیں جن سے ان کو متعارف کرنا بے حد ضروری ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ممتاز اور مشہور محقق ڈاکٹر شیلا راج نے اس مہم کو انجام دینے کا بیڑا اٹھایا۔ حال ہی میں انھوں نے ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد کے پرہجوم عام جلسوں میں تین محققانہ مقالے پیش کیے۔ دو آصف جاہی حکمرانوں نواب میر محبوب علی خاں نظام سادس اور نواب میر عثمان علی خاں نظام سابع پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی تھی۔ مرکزی موضوع ''ہندو مسلم اتحاد اور مذہبی رواداری'' تھے جو آصف جاہی حکومت میں پروان چڑھے۔ یہ مقالے اب ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے (جس کا راقم الحروف صدر ہے) کتاب کی شکل میں شائع کیے گئے ہیں۔

شاہی خاندان سے گزشتہ (۳۰) سالہ شخصی روابط کا جب میں خود جائزہ لیتا ہوں تو مجھے سمجھ میں آجاتا ہے کہ ڈاکٹر شیلا راج نے مجھ سے اس کتاب کا پیش لفظ تحریر کرنے کی خواہش کیوں کی۔ ان کی اس خواہش کی تکمیل میرے لیے ایک اعزاز بھی تھی اور خوشی کا باعث بھی۔

آج ہم میں سے کتنے لوگ واقف ہیں کہ آصف جاہ اول نے اپنی وصیت میں ''تکثیریت اور سیکولر معاشرے'' کے نظریہ کی وضاحت کی ہے' جس پر ان کے جانشینوں کو عمل کرنا تھا؟ ہم میں سے کتنے لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ سابق ریاست حیدرآباد ایک اسلامی مملکت نہیں تھی اور شاہی سرپرستی پر کسی ایک فرقہ کی اجارہ داری نہیں تھی؟ ہم میں سے کتنے افراد کو علم ہے کہ نظام کی فیاضی سے استفادہ کرنے والوں میں مشہور نوبل انعام یافتہ سرسی۔وی۔رامن' انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس' بنگلور' بنارس ہندو یونی ورسٹی' ایلورہ کے قریب واقع شیو جی کا گریشنیشور مندر' بالاجی مندر اور انت گری مندر شامل ہیں؟ ہم میں سے کتنے افراد کو معلوم ہے کہ ۱۹۱۷ء میں ورنگل میں ایک مندر اور مسجد میں اراضی کا تنازعہ تھا جس کا فیصلہ نظام کی مقرر کردہ کمیٹی نے جو دو مسلمانوں اور ایک ہندو پر مشتمل تھی۔مندر کے حق میں دیا تھا۔اس فیصلہ پر من وعن عمل آوری بھی ہوئی تھی؟ (اس کی ستائش محمد علی جناح نے ان دنوں اپنی ایک تقریر میں بھی کی تھی کہ یہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ایک درخشاں مثال ہے جس کی تقلید باقی برصغیر کو کرنی چاہیے) ہم میں سے کتنے لوگ جانتے ہیں کہ باوقار گوکھلے اسکالرشپ جو گوپال کرشن گوکھلے سے موسوم ہے نظام کالج میں قائم کیا گیا تھا؟

کیا آپ اس بات سے واقف ہیں کہ ایچ۔ای۔ایچ۔دی نظامس چیریٹیبل ٹرسٹ ایک عوامی ٹرسٹ ہے جو نواب میر عثمان علی خاں نے اقتدار سے بے دخلی کے ایک عرصہ بعد قائم کیا تھا۔یہ ٹرسٹ بہ لحاظ ذات پات' رنگ ونسل اور مذہب وملت تمام طبقات کی بہبود کے لیے ہے۔جس سے تعلیمی' طبی اور گزارے کی ضروریات کی تکمیل کی جاتی ہے؟ کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ باوقار نظامس انسٹی

ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس (جواب ایک یونی ورسٹی ہے) فیاضی اور سیکولر نظریہ کی علامت ہے قلب شہر حیدرآباد میں (۲۵) ایکڑ پر محیط ہے (۹۹) سال کے لیے ایک روپیہ کرایہ پر بطور پٹہ حکومت کو تحفہ میں دے دیا؟ جس کا انتظام مرکز برائے طبی مہارت کے ذمے ہے جو ہسپتال کی مخیّرانہ خصوصیات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

حیدرآبادی روایات کے ''مغلائی ذائقہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کے۔پی۔ایس مینن۔آئی۔سی۔ایس نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''مینی ورلڈس'' کئی دنیائیں (many world) میں تحریر کیا ہے کہ ''مغلائی بھی شہر حیدرآباد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوستی کا وسیلہ بنی۔کوئی مذہبی یا فرقہ وارانہ پریشانی نہیں تھی''۔

ڈائرکٹر جنرل پولیس حیدرآباد۔ایس۔ٹی ہولنس (Mr.S.T. Hollins) (۱۹۳۵ تا ۱۹۴۲) نے ''جب شاندار عوامی عمارتیں دیکھیں تو حیرت زدہ ہوگئے۔بہترین رہائشی علاقے، سایہ دار سڑکیں اور تالاب، عمدہ عوامی خدمات، اجنتہ اور ایلورہ کی شہرۂ آفاق آثار قدیمہ کی تاریخی یادگاریں اور ریاست کے عمومی رویہ نے انھیں حیرت زدہ کردیا۔ریاست پر شہریوں کا فخر بالکل واجبی تھا'' (خودنوشت سوانح عمری صفحہ ۲۳۰) حیدرآباد کو عثمانیہ یونی ورسٹی پر فخر تھا۔یہ اولین یونی ورسٹی تھی جہاں ایک ہندوستانی زبان ذریعہ تعلیم تھی۔سر والٹر مانکٹن (Sir.Walter Monekton) نے اپنی نجی یادداشتوں میں نظام سابع کو ایک ''ذی شعور اور مہذب اردو اور فارسی کا شاعر، اجنتہ کی تاریخی یادگاروں کے تحفظ کے لیے نئی نسلوں کی احسان مندی کا مستحق قرار دیا ہے''۔نہرو نے حیدرآباد کو ''ہندوستانی ثقافت کا خوردبینی نمونہ، ایک چھوٹا سا ہندوستان قرار دیا۔

نظام کی فیاضی اور سیکولرزم کے بارے میں اب بھی شک کرنے

والوں کے لیے بہتر ہوگا کہ ڈاکٹر شیلا راج کی تحریر کردہ دیگر کتابیں ''عہد وسطیٰ سے عہد حاضر تک'' (Mediaevalism to Modernism) ''ایک عہد کی تصویر'' (Portrait of an Era) ''اور نظامس کی روایات'' (The Legacy of the Nizam s) کا مطالعہ کریں جو اب ایچ۔ای۔ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری۔ملک پیٹ میں دستیاب ہیں۔وہ پرانی حویلی کے نظامس میوزیم کا دورہ بھی کرسکتے ہیں اور وہاں نمائش کے لیے رکھی ہوئی قیمتی اشیا کے درمیان' نواب میر عثمان علی خاں کے انتقال پر حکومت آندھرا پردیش کے اعلامیہ پر بھی نظر ڈال سکتے ہیں۔۱۹۶۷ء میں حیدرآباد میں آپ کے جلوس جنازہ میں شامل دس لاکھ سوگواروں کی متاثر کن تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔

کئی دیگر فانی انسانوں کی طرح نظام نہ تو ولی تھے اور نہ ہی گناہ گار جیسا کہ انہیں ظاہر کیا جاتا ہے۔یعنی عموماً لوگ ان کے ایک طرفہ رخ کو ہی دیکھتے' سمجھتے اور پیش کرتے ہیں۔اس دور کی سیاسی اقتدار جاگیر دارانہ اور سامراجی تھی۔لیکن عوام خوش تھے۔ یہ ایک مہربان' فیض رسا شاہی حکومت تھی جدید اور دوربین۔ جب ہم نظام کی حکمرانی کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں جواہر لال نہرو کے دانشورانہ الفاظ یاد رکھنا چاہیے ''جہاں بھی اچھائی حاصل ہو حاصل کرلو' برائی کو چھوڑ دو یا نظر انداز کردو جہاں کہیں بھی ہو'' لیکن افسوس موجودہ دور میں جیسا کہ شیکسپئر کا قول ہے۔''اچھائی اکثر ہڈیوں کے ساتھ دفن ہو جاتی ہے۔''

قصہ مختصر یہ لیکچرس ہماری آنکھوں کے سامنے ایک باریک بین تحقیق کے ذریعے آصف جاہی حکمرانوں کے بارے میں معلومات کا خزانہ پیش کرتے ہیں۔ تحقیق کا یہ عمل یقیناً ایک محنت طلب کارنامہ ہے اور ایک پیاز کے چھلکے اتارنے

کے مترادف ہے۔تہ درتہ یہاں تک کہ آپ مغز تک پہنچ جائیں ۔نچوڑ حاصل کرلیں۔اس کے لیے درست رجحان ضروری ہے۔لامحدود صبر واستقلال درکار ہے ان تھک محنت شاقہ کی ضرورت ہے۔معروضیت' بہتر ترسیلی مہارتوں' تربیت اور سب سے زیادہ مالی وسائل کی ضرورت ہے۔ڈاکٹر شیلا راج اس مہم کے لیے اچھی طرح تیار ہیں اور انھوں نے لائقِ ستائش کارنامہ انجام دیا ہے۔ان کی کتابیں یقیناً مؤرخین کی دلچسپی کا محور' ماہرین تعلیم' محققین' عوام' طلبا اور دانشوروں کے علاوہ ان شہریوں کی توجہ کا مرکز بنیں گی جنھیں شہرۂ آفاق حیدرآبادی تہذیب کی فکر ہے جو بڑی تیزی سے معدوم ہورہی ہے۔خدا ان کو زیادہ زور قلم عطا کرے اور ان کی عمر دراز کرے۔

''پام گرو''

۱۱/۷' شانتی نگر

حیدرآباد۔۵۰۰۰۲۸

بتاریخ ۲۴/اکتوبر ۲۰۰۷

محمود بن محمد

آئی۔پی۔ایس (ریٹائرڈ)

سابق سفیر بھارت برائے سعودی عربیہ

ٹرسٹی۔ایچ۔ای۔ایچ۔دی نظامس

چیریٹیبل ٹرسٹ اور دیگر ٹرسٹس

۲۹.۶.۹

تعارف

زیرِ نظر کتاب ''شاہانِ آصفیہ کی رواداری اور ہندو مسلم روایات'' کی مصنفہ ڈاکٹر شیلا راج حیدرآباد کے معزز و علم دوست خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جو سرکار و دربار میں ذی وجاہت، معتبر و مقتدر رہا۔ شیلا کے والد شری پرتھوی راج محکمہ زراعت کے ناظم تھے۔ چچا اندر راج تمنؔا شاعر تھے۔ شیلا کی شادی ہوئی تو راجا گردھاری پرشاد باقیؔ کے پڑپوتے ڈاکٹر نارائن راج سے۔ ڈاکٹر راج Dairy Science میں پی ایچ۔ڈی ہیں۔ راجا گردھاری پرشاد باقیؔ اس خاندان کے ماہِ درخشاں تھے۔ راجا محبوب نواز ونت خطاب تھا بنسی راجا کے نام سے مشہور تھے۔ صرفِ خاص اور شاہی محلات کے انتظامات ان ہی کے سپرد تھے۔ باقیؔ شاعر تھے، فنِ عروض، علم بدیع و تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ حضرت میر شمس الدین فیضؔ کے شاگرد تھے۔ اردو اور فارسی نظم و نثر میں ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

باقیؔ کے صاحبزادے راجا نرسنگ راج عالیؔ، ڈاکٹر شیلا راج کے دادا خسر ہوتے ہیں۔ عالیؔ اردو، فارسی، ہندی اور مراٹھی زبان و ادب کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ غزل اور رباعی ان کے خاص میدان تھے۔ مہاراجا کشن پرشاد کے ماہانہ مشاعروں کا انتظام انہیں کے سپرد تھا۔ وہ نواب فصاحت جنگ جلیلؔ کے شاگرد تھے۔ عالیؔ کے فرزند نرہر راج ساقیؔ شیلا کے خسر تھے۔ شیلا راج اس طرح میکے اور

سسرال دونوں طرف سے علم وادب کی دولت کی وارث ثابت ہوئیں۔

ڈاکٹر شیلا راج نے اردو اور تاریخ دونوں مضامین میں عثمانیہ یونی ورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ایم۔اے کے بعد محبوبیہ جونیر کالج میں اردو کی لکچرر مقرر ہوئیں۔اردو کے ساتھ ساتھ تاریخ کی کلاسس بھی انہیں لینی پڑتی تھیں۔شادی کے بعد ملازمت چھوڑ کر بمبئی جانا پڑا۔وہاں انہوں نے شریمتی ناتھی بائی دامودر ٹھاکرسی ویمنس یونی ورسٹی، بمبئی سے تاریخ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔مقالہ کا عنوان تھا Social Cultural and Economic Developments in Hyderabad 1869 to 1911'' یہی مقالہ بعد میں Mediaevalism to Modernism کے عنوان سے **1987** میں بمبئی سے شائع ہوا۔اپنے وسیع مطالعے، گہرے تجزیاتی نقاطِ نظر کے باعث ریاست حیدرآباد کی تہذیبی اور سیاسی تاریخ میں وہ اتھاریٹی سمجھی جاتی ہیں۔آصف جاہ سادس وآصف جاہ سابع کے دور حکومت کی علمی، ادبی، تاریخی، مذہبی سرگرمیوں پر ان کے (۳۰) تحقیقی مقالے اردو اور انگریزی رسائل واخبارات میں شائع ہو کر پسند کیے گئے۔حیدرآباد اور حیدرآباد سے باہر کئی علمی وتحقیقی اداروں میں انہیں لکچرز کے لیے مدعو کیا گیا۔انہوں نے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اسٹڈیز، انڈین ہسٹری کانگریس، انڈین ہسٹری اینڈ کلچرل سوسائٹی، ایشیاٹک سوسائٹی، عثمانیہ یونی ورسٹی، مکرم جاہ ایجوکیشنل ٹرسٹ، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ وغیرہ میں توسیعی لکچرز دیئے اور مقالے پیش کیے۔تاریخ دکن کے تحفظ وتعارف کے سلسلے میں ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے شریمتی پریم لیلا ٹھاکرسی جیسا گراں قدر ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔

ڈاکٹر شیلا راج اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی پر بھی عبور رکھتی

ہیں۔۱۹۹۶ میں انہوں نے ایک معرکتہ الآرا کتاب (Portrait of an Era) لکھی جو لندن سے شائع ہوئی۔اس کتاب میں انہوں نے بنسی راجا گردھاری پرشاد کی حیات اور سماجی و علمی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے حیدرآباد کی ملی جلی تہذیب' رواداری اور عہد آفریں واقعات و حالات بھی پیش کیے ہیں۔ڈاکٹر شیلا راج ایک اچھی مترجم بھی ہیں۔پاکستان سے شائع ہونے والی ایک دستاویزی کتاب ''مملکت آصفیہ'' کی دونوں جلدوں کا انہوں نے اردو سے انگریزی میں بعنوان (The Legacy of the Nizam s) ترجمہ کیا۔یہ کتاب نظامس اردو ٹرسٹ حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ڈاکٹر شیلا نے نہ صرف اردو سے انگریزی میں ترجمے کیے انہوں نے فارسی سے بھی اردو میں ترجمہ کر کے گردھاری پرشاد باقیؔ کی دو تصانیف ''شاہی شادی'' اور ''توشہ عاقبت'' شائع کیا شیلا صرف اچھی مؤرخ ہی نہیں ہیں شعروسخن کا بھی اچھا ذوق رکھتی ہیں۔وہ سخن سنج نہیں سخن فہم ہیں۔انہوں نے راجا گردھاری پرشاد باقیؔ کے دوسرے فرزند راجا محبوب راج محبوبؔ کا کلام جو عوام کی نگاہوں سے اوجھل خاندانی بیاضوں میں محفوظ تھا اسے ''دیوانِ محبوب'' کے نام سے اکتوبر ۲۰۰۶ میں نرہری پرشاد چیارٹیبل ٹرسٹ کے زیراہتمام شائع کیا۔

حکومت حیدرآباد کے فرماں رواؤں نے اپنی ریاست کے حدود اربع بڑھانے رزم آرائیاں کرنے کے بجائے علم وادب کے فروغ' انسانیت کی بقاو ترویج' رعایا پروری' عالموں' فن کاروں کی سرپرستی' محبت ورواداری سے دلوں پر فتح پانے کی کوشش کی ہے۔زیرنظر کتاب میں مشمولہ تینوں مضامین شاہانِ آصفیہ خاص طور پر آصف سادس اور آصف سابع کی رواداریوں' وسیع النظری' روشن خیالی' دوربینی' محبت واخوت کو اجاگر کرنے والے مضامین ہیں۔ڈاکٹر داؤد اشرف نے

آرکائیوز کے ریکارڈز سے ریاست حیدرآباد کے حکمرانوں کی ہمہ جہتی خدمات پر مہر تصدیق ثبت کی ہے تو ڈاکٹر شیلا راج نے تاریخ کے مستند حوالوں سے آصفی شہریاروں کے طرز حکومت اور رعایا پروروں پر مقالے لکھ کر نئی نسل اور آج کے جمہوری حکمرانوں کو جو عوام کے نمائندے ہیں آئینہ دکھایا ہے۔ نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان بھر کے ہندو مسلم بھائیوں کو آپسی بھائی چارگی، مذہبی رواداری یگانگت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے دیس کی آبادی کی ایک کثیر تعداد امن، شانتی اور بھائی چارگی میں یقین رکھتی ہے۔ جھگڑے فساد، خون خرابہ دور حاضر کے سیاسی حربے ہیں۔ یہ وہ لوگ کرواتے ہیں جو ملک وقوم کی خدمت کے لیے سیاست میں نہیں آتے بلکہ اپنی ذات، اپنے مفاد، اپنے خاندان اور اپنے احباب کی خدمات ان کا اولین مقصدِ زندگی ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے جیسا راجا ویسی پرجا، شہریاروں کی نیتیں خراب ہوں تو گرانی کا بڑھنا، بدامنی کا پھیلنا، عوام کے غریب اور ناپرسان حال طبقے کا غریب تر ہونا لازمی ہے۔

پھول گلشن میں کیسے مسکائیں
باغبانوں کی نیتیں ہیں خراب

۱۷۲۴ سے ۱۹۴۸ تک عہد آصفی کے دوسو پچیس (۲۲۵) سالہ دور حکومت میں نہ مسجدوں کو پامال کیا گیا نہ منادر لوٹے گئے نا ہی کہیں انسانیت کے خون کی ہولی کھیلی گئی۔ آصفیہ حکمرانوں نے خود کو اپنی رعایا کا ذمہ دار صدر خاندان سمجھا۔ مسلمانوں اور خصوصاً ہندوؤں کو اپنی آنکھوں کی طرح عزیز رکھا۔ ان کے حقوق کی حفاظت کی۔ داد ودہش اور حسن سلوک سے پیش آئے۔ رہن سہن، وضع قطع کے اختیار کرنے میں بھی اپنی رعایا کی لجپائی کا خیال رکھا۔ ہندو مسلم جو ریاست

حیدرآباد کی اکثریت اور کثیر اقلیت تھے دونوں نے ایک دوسرے کے پہناوے غم و خوشی کے رسم و رواج کو کچھ اس طرح اپنا لیا کہ من و تو کی تفریق ہی نہیں رہی۔ ڈاکٹر شیلا راج نے نہ صرف ان تہذیبی اور تمدنی امور کی اپنے مقالوں میں نشاندہی کی بلکہ شاہان ریاست حیدرآباد کی فراخ دلانہ داد و دہش' عدل و انصاف' حکومت اور شہریاری کے کئی کارنامے گناتے ہوئے ان بادشاہوں اور کارکنانِ ریاست حیدرآباد کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ آصفیہ بادشاہوں کے طرز حکومت سے یہ بات صد فیصد سچ ثابت ہوتی ہے کہ ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'' ہندو مسلم ان کی دو آنکھیں تھیں۔ عدل و انصاف کو وہ مذہب و تعصب کی ترازو میں نہیں تولتے تھے۔ رشوت ستانی کا بازار گرم نہیں تھا۔ انکم ٹیکس نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ دیر و حرم دونوں ان کے لیے قابل احترام تھے۔ مساجد کو عطیہ دیا تو مندروں اور گردواروں کو بھی عطا کیا۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ' ندوۃ العلماء' دارالمصنفین کو مالی امداد فراہم کی تو بھنڈارکر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور بنارس ہندو یونی ورسٹی' شانتی نکیتن کو بھی وافر مالی امداد دی۔ قرآن کے تراجم کے لیے مترجمین کو وظیفے مقرر کیے تو مہا بھارت کی اشاعت کے لیے بھی گرانقدر رقم گیارہ سال تک دی جاتی رہی۔ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع اپنے لیے ضرورت سے زیادہ کفایت شعار تھے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے انہیں ''کنجوس'' مشہور کر دیا۔ لیکن اعلیٰ مقاصد کے لیے دولت کے دریا بہا دیئے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی بنائی تو اس کے فن تعمیر میں ہندو مسلم فن تعمیر کی خصوصیات کو ملحوظ رکھا۔ مسجد وہاں اس لیے نہیں بنوائی کہ تعلیم گاہ خود ایک عبادت گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ عوام کے دل بھی کدورتوں سے پاک تھے۔ دوا خانے' تعلیم گاہیں بلا تفریق مذہب و ملت سب کے لیے کھلی تھیں۔ سرکاری

دواخانوں میں نہ صرف مفت علاج ہوتا تھا اعلیٰ درجہ کی غذا بھی مریضوں کو فراہم کی جاتی تھی۔ڈاکٹر شیلا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''آصف سابع نے ایک شخص کو دیکھا جو دونوں پاؤں سے محتاج و معذور ہے انہیں خیال آیا کہ ان کی ریاست میں ہڈیوں کے علاج کے لیے کوئی دواخانہ نہیں تو انہوں نے نظامس آرتھوپیڈک میڈیکل انسٹی ٹیوٹ قائم کردیا جہاں مریضوں کو کم سے کم اخراجات پر طبی سہولتیں دی جاتی تھیں''۔لیکن وہی دواخانہ آج کے عوامی دور میں کسی کارپوریٹ ہاسپٹل سے کم نہیں۔اس عہد میں بھی بڑے بڑے عہدوں پر غیر مسلم ہی فائز تھے مگر اپنے عہدوں کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔یہ اور اس کے علاوہ بہت سارے واقعات ڈاکٹر شیلا نے اپنی ان تحریروں اور مقالوں میں پیش کیے ہیں۔ڈاکٹر شیلا راج کے یہ تین مقالے عہد آصفیہ کی سوا دوسو سالہ تہذیبی تاریخ کے بارے میں لکھی گئیں بے لاگ اور بے تعصب ذہن کی تحریریں ہیں جس میں نہ کہیں طرفداری' نہ خوشامد نہ ہی کسی کی خوشنودی چھپی ہے' نہ من گھڑت واقعات نگاری ہے۔یہ معروضی پیش کش تاریخی شواہد کی روشنی میں تیار کردہ دستاویزیں ہیں جو نئی نسل کو حیدرآباد دکن کے درخشاں ماضی کی ایک ہلکی سی جھلک دکھلا سکتی ہیں۔

میں ڈاکٹر شیلا راج کی ممنون ہوں کہ انہوں نے ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی درخواست پر یہ مقالے لکھے اور وہاں کے تین اجلاسوں میں انہیں پیش کیا۔انہیں سننے کے لیے ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے آڈیٹوریم میں سامعین کی ایک کثیر تعداد موجود رہتی تھی جن میں بلا لحاظ عمر و مذہب خواتین و حضرات شامل تھے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ ماضی قریب کے زرین واقعات سننے کے لیے کتنے بے تاب ہیں۔ان لوگوں کی یہ تڑپ اپنے آپ میں کیا یہ

نہیں کہتی کہ کاش ہمارا موجودہ دور بھی ایسا ہی کچھ ہوتا!

ڈاکٹر شیلا راج کو ان کی اہم کاوشوں پر میں دلی مبارکباد دیتی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ وہ حیدرآبادی تہذیب کے ایسے انمول خزانوں کی بازیافت کرتی رہیں گی اور عوام کو تاریخی حقائق سے واقف کرواتی رہیں گی۔

حیدرآباد

اشرف رفیع
نائب صدر
ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

دیباچہ

آصف جاہی دورِ حکومت کی دوسو سالہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ شاہانِ آصفیہ کے کارنامے ہر اعتبار سے قابل تقلید ہیں جو نہ صرف موجودہ نسل بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی مشعل راہ ہیں۔ نظام الملک آصف جاہ اول کا تاریخی وصیت نامہ جو دنیا کی اہم ترین سیاسی دستاویز مانی جاتی ہے۔ سترہ فقرات پر مشتمل ہے۔ اس وصیت نامہ کا بغور مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ وصیت نامہ رواداری، قومی یکجہتی، راعی ورعایا کے تعلقات، انسانیت، غرباء پروری اور عدل پروری کو اجاگر کرتا ہے۔ ہر آصف جاہی فرمانروا نے اپنے مورث اعلیٰ کی وصیت نامہ پر عمل کر کے اپنے اپنے دور حکومت میں رواداری اور یکجہتی کی جو مثال قائم کی وہ بے مثال ہے۔ مملکتِ آصفیہ کے آخری دو تاجدار میر محبوب علی خاں آصف سادس اور میر عثمان علی خاں آصف سابع کی بیدار مغزی، دور بینی، فیاضی اور رواداری اپنی آپ نظیر ہے۔ میر محبوب علی خاں نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد کہا تھا کہ 'حیدرآباد کی رعایا کی خوش حالی اور امن وامان اور یکجہتی سے بڑھ کر کوئی اور خوشی نہیں ہو سکتی'۔ میر عثمان علی خاں نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا کہ 'میں نہیں چاہتا کہ اپنی تنگ نظری سے کسی بھی مذہب یا قوم کو ٹھیس پہنچاؤں اور میں متعصب کہلاؤں۔ میری اور میرے مورث اعلیٰ کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کو ایک سمجھیں اور سب کے ساتھ ہم آہنگی سے پیش آئیں۔ مجھے قوی امید

ہے کہ آنے والی نسلیں بھی ان پر عمل پیرا رہیں گی۔

قابل احترام اور قابل تعریف ہیں وہ ہستیاں جنہوں نے ہندو مسلم مساوات پر زور دیا۔ ان کو بھائی چارگی کا سبق دیا انہیں بانٹنے یا ان میں پھوٹ ڈالنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور دو سو سال تک اپنے عاملانہ برتاؤ، التفات والفت اور اتحاد و ہم آہنگی کی بدولت سینکڑوں لوگوں کا دل جیتا اور ملک میں امن و امان کی فضاء برقرار رکھی۔

شہر حیدرآباد آصف جاہی دور میں مذہب وملت اور زبان ونسل کی بوقلمونی کے باوجود صدیوں سے امن و امان و باہمی رواداری اور یکجہتی کا مخزن اور مرجع رہا۔ سبھی اس بات سے واقف ہیں کہ اس شہر کا آغاز ہندو مسلم میل جول اور یگانگت کا نتیجہ تھا۔ اس کے آباد ہونے کے بعد سے ہی یہاں کے لوگ باہمی میل ملاپ، خلوص و مروت اور امن وچین کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس میل ملاپ نے دونوں فرقوں کو باہم اتنا قریب کر دیا کہ ان میں امتیاز کرنا مشکل تھا۔ لہذا اس میل ملاپ اور باہمی اتحاد نے ایسی روایات کو جنم دیا جس کی اپنی تاریخ ہے۔ یہاں کے خواص وعوام کے سوچنے اور سمجھنے کے ڈھنگ میں غیر معمولی یکسانیت ہے۔

آج حالات بدل چکے ہیں۔ آج کے سیاسی رہنماؤں کی سوچ اور سمجھ پر فرقہ واریت کا رنگ زیادہ غالب ہے۔ تعصبیت کا یہ رنگ اس بات کی دعوتِ فکر دیتا ہے کہ کیا شاہان آصفی کی رواداری اور حیدرآبادی ہندو مسلم روایات اپنی سابقہ خصوصایت برقرار رکھیں گی یا ہمیشہ کے لیے ان کو بھلا دیا جائے گا؟

۱۹۴۷ء میں ہم نے آزادی حاصل کی۔ چھوٹی بڑی ریاستوں کو ختم کیا گیا اور لسانی بنیادوں پر ریاستیں بنائی گئیں۔ آزادی کے ان ساٹھ سالوں میں ایک عام آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ آج کی ان ریاستوں اور سیاسی رہنماؤں سے وہ حکمران

اوران کی ریاستیں ہزار درجہ بہتر تھیں جو رعایا پرور اور غرباء پرور تھے۔ جنہوں نے تمام مذاہب کو ایک رشتہ میں باندھ رکھا تھا۔ نہ ہندو مسلم میں امتیاز تھا نہ پارسی اور سکھ کی تفریق تھی۔ سکون وچین کی زندگی تھی۔ آج کے نام نہاد سیاست داں مذہب کے نام پر اپنے مفاد اور اپنے اقتدار کے لیے تعصب کو ہوا دے رہے ہیں مختلف فرقوں میں ہی نہیں بلکہ ایک ہی فرقہ میں پھوٹ ڈال رہے ہیں۔ ریزرویشن کے نام پر دنگے ہورہے ہیں۔ مذہب کی آڑ میں مقدس مقامات کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ رواداری اور یکجہتی کی جگہ فرقہ واریت اور تعصب کی آگ کو بھڑکایا جارہا ہے۔ افسوس آج کل کے لیڈروں اور رہنماؤں کی عقل پر ہوتا ہے جو آزادی کے اصل مفہوم کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ آزادی کے متوالوں نے جس مقصد اور جس جذبہ کے تحت ہندوستان کو آزاد کرایا تھا وہ فوت ہوگیا۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور دیگر سیاسی رہنماؤں نے "Unity in diversity" کا جو خواب دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

قبل اس کے کہ یہ رواداری اور سابقہ روایات ماضی کے دھندلکوں میں ہی گم ہوجائیں۔ حیدرآبادیوں کا فرض ہے کہ حیدرآبادی رواداری اور ان درخشندہ روایات کو جن کی وجہ سے وہ ہمیشہ ممتاز اور نمایاں رہے ان کی حفاظت کریں۔ جس طرح آصف جاہی حکمرانوں کی سات پشتوں نے آصف جاہ اول کے وصیت نامہ پر عمل کر کے رواداری اور بھائی چارگی کو تقویت دی اور مساوات کا سبق دیا اسی طرح موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی یہ واجب ہے کہ وہ اپنے شہر حیدرآباد میں رواداری، بھائی چارگی اور یکجہتی کی فضاء بنائے رکھیں اور سابقہ ہندو مسلم روایات کو مشعل راہ بنا کر فرقہ واریت میں نہ بانٹیں بلکہ یکجہتی کے مضبوط

رشتے سے باندھ رکھیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب ان ہزاروں حیدرآبادیوں کے لیے ممدومعاون ثابت ہوگی جنھیں حیدرآباد کی قدیم روایات، تہذیبی، ثقافتی اور اخلاقی اقدار سے دلچسپی ہو۔

حیدرآبادی ہونے کے ناطے میری دلی تمنا تھی کہ میں اپنے بھائی بہنوں تک حیدرآباد کی عدیم المثال آصفی رواداری اور یہاں کی خصوصی روایات کو اسٹیج اور میڈیا کے ذریعے پہنچاؤں۔ مجھے اس بات کی مسرت ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔

میں ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی بے حد ممنون و مشکور ہوں جہاں میرے تین لکچرس کا اہتمام کیا گیا اور مجھے سامعین تک اپنے خیالات پہنچانے کا موقع دیا۔

صدر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ محترم جناب محمود بن محمد صاحب کی میں تہ دل سے شکرگزار ہوں کہ آپ نے اپنے انسٹی ٹیوٹ کی اگزیکٹیو کمیٹی میں مجھے شامل کیا اور شاہان آصفی اور اس دور کی ہندو مسلم روایات کو حاضرین کے روبرو پیش کرنے کا موقع دے کر میری حوصلہ افزائی کی اور میری توقیر بڑھائی۔ آپ کے قلم نے اس دور کی جو عکاسی پیش لفظ میں پیش کی ہے اور اپنے تیس سالہ تعلقات جو شاہی خاندان کے ساتھ تھے ان کا جائزہ بخوبی لیا ہے۔ آپ کے شکریہ کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

میں ڈاکٹر اشرف رفیع صاحبہ نائب صدر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور سابق پروفیسر اردو عثمانیہ یونی ورسٹی کی بطور خاص شکرگزار ہوں جنھوں نے ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے مجھے نہ صرف متعارف کیا بلکہ اپنے زورِ قلم سے آپ نے جامع تعارف لکھ کر ہزاروں قارئین سے بھی مجھے روشناس کرایا۔

اس کتاب میں شامل تمام لکچرس مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں پیش کیئے گئے ہیں۔ان تمام لکچرس کو اہتمام کے ساتھ اور نمایاں انداز میں شائع کرنے کے لیے میں میر کمال الدین علی خاں اعزازی سکریٹری ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی بے حد ممنون ہوں۔آپ کی دلچسپی کے باعث اس کتاب کی اشاعت ممکن ہوسکی۔

میں مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اگزیکیٹو کمیٹی کے تمام ممبران کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے خلوص اور دلچسپی سے اس کتاب کی اشاعت کی تائید کی۔

میں مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انٹی ٹیوٹ کے دیگر اسٹاف ممبروں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے میری مدد کی۔

آخر میں جلال الدین اکبر بانی ''اردو کمپیوٹر سنٹر'' کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے اس کتاب کو طبع کرنے اور فوٹوگرافس کی تیاری میں اپنا بھرپور تعاون دیا اور اپنی محنت اور سچی لگن سے اس کتاب کو قارئین تک جلد از جلد پہنچانے میں میری مدد کی۔

ڈاکٹر شیلا راج

حیدرآباد

۲۰۰۷ء

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس

۱۸۶۹ء۔۱۹۱۱ء

حضور پُرنور دستارِ مبارک پر سرپیچ مرصع اور گلے
میں موتیوں کا ہار زیبِ تن کیے ہوئے

۱۸۸۴ء

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کی رواداری

ہندوستان کی تاریخ میں شہر حیدرآباد کو ہمیشہ ایک اہم اور مستقل جگہ حاصل رہی ہے۔ دکن کا یہ دولت خیز سطح مرتفع جو ہند کی دو بڑی دریاوں کے درمیان سر بلند ہے۔ کچھ اس طرح واقع ہوا ہے کہ زمانہ قدیم سے مختلف النسل اور مختلف المذاہب اقوام کا مرجع ہی نہیں تمدنی ترقیوں کا گہوارہ بنا رہا۔ قرب و جوار سے آکر بسنے والی قوموں کا سنگم بھی یہاں ہوا۔ ان کے آپسی میل جول میں اضافہ ہوا۔ اس لطیف آمیزے میں تہذیب و تمدن کی مختلف اصطلاحوں کا مسلسل تبادلہ ہوتا رہا۔ اور ایک تہذیب دوسری تہذیب پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوئی کہ کلچر کا یہ مجموعہ انفرادی رنگ اختیار کر گیا اور سارے ہندوستان میں شہر حیدرآباد اپنے مخصوص انفرادی کلچر کے لئے مشہور ہو گیا۔

مغلیہ سلطنت کی کمزور اور گرتی ہوئی عمارت کو جب خاندان آصفیہ کے بیدار مغز بادشاہوں نے مستحکم کیا اور دکن میں اپنی جڑیں مضبوط کرنی شروع کیں تو اپنی سلطنت کی بنیادیں امن و آشتی کی غیر متزلزل چٹانوں پر رکھیں جس سے دکن میں ایک ایسی سلطنت کی ابتدا ہوئی جس میں مختلف قوموں کے سنگم نے آرٹ اور فنون کو زندہ کیا اور اس موافق ہوا میں اپنے شجر تمدن کو پھر سے تازہ کیا۔

آصف جاہی دور کی اساس مذہبی رواداری پر رکھی گئی تھی۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ جب نظام الملک آصف جاہ اول نے دکن کا رخ کیا تو اس

جلیل الشان بزرگ ہستی کے ہمراہ غیر مسلم بھی آئے جنہوں نے ابتداء ہی سے شاہان آصفیہ کی وفاداری اور جان نثاری کو اپنا مسلک و مشرب بنالیا اور کچھ اس طرح سے ملک و مالک کی خدمت کی کہ ان کی نظروں میں اپنے لئے خاص جگہ بنالی ۔ انہیں جاگیریں، مناصب اور خدمات جلیلہ سے سرفراز کیا گیا اور انہیں ہمیشہ کے لئے وابستگان دربار آصفی میں امتیاز دیا گیا ۔ نظام الملک آصف جاہ اول کے جانشینوں نے بھی اسی حکمت عملی کو اپنایا ۔ ان میں میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا نام سرِ فہرست آتا ہے ۔ آپ نے اپنے دورِ حکومت میں مشفقانہ رویہ ۔ وسیع المشربی، بے تعصبی اور مذہبی رواداری سے عوام وخواص کے دلوں میں خصوصی جگہ بنالی تھی ۔ خاص طور پر رواداری کی آپ نے ایسی مثال قائم کی کہ یہاں بسنے والے مختلف مذاہب کے باشندوں میں معاشرتی اور تمدنی نقطہ نظر سے کوئی فرق نہیں رہا ۔ مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی مختلف فرقوں کے درمیان باہمی ارتباط اور آپسی تعلقات کو فروغ دیتی ہے ۔ اس لحاظ سے نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا دور یقیناً دکن کی تاریخ کا وہ زرین باب ہے جس میں آپ کی رواداری سے ہندو مسلم اتحاد، بھائی چارگی اور قومی یکجہتی کو جو تقویت یہاں ملی اس کی مثال ہندوستان کے کسی اور حصہ میں شاید ہی ملے گی ۔ اس دور کا کلچر، نظم ونسق اور فنون لطیفہ اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ آپ نے بلاتفریق مذہب وملت حکومت کی آپ کے اصول مذہبی تعصب سے پاک تھے ۔ آپ نے اپنے مسلک آزادہ روی سے ہندو اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی ۔ سب کے ساتھ مساویانہ برتاؤ رکھا ۔ مذہبی حیثیت سے قطع نظر سیاسی امور میں بھی مذہبی رنگ کا شائبہ نہیں ہوتا تھا ۔ تقسیم اعزازات، مناصب، جاگیرادائیگی

جواہر وخلعت میں کبھی ہندو اور مسلمانوں میں امتیاز نہیں برتا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ عہدوں کی تقسیم بھی مذہب وفرقے سے پرے ہوا کرتی تھی[1]۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں دوش و بدوش نہ تھے۔ حیدرآباد کے نظم ونسق میں ہندو اور مسلمان دونوں مامور کئے جاتے تھے۔

حیدرآباد میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ لہٰذا مسلمان ملک اور لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کرتے تھے یعنی فوج میں شامل تھے۔ ہندو جنہیں تلوار سے زیادہ قلم کا دھنی مانا جاتا ہے خزانے کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ عموماً پیشکار ہندو ہوتے اور ان کے تحت معتمدی سے جڑے کاروبار ہوتے تھے۔ دفتر دیوانی اور دفتر مال بھی ہندوؤں کی نگرانی میں تھے[2] نظام اور امرائے پائیگاہ کا تعلق سنی طبقہ سے تھا۔ امرائے پائیگاہ کو شاہی خاندان سے رشتہ ازدواج قائم کرنے کا حق حاصل تھا۔ وہ نظام کے نجی محافظ کہلاتے تھے۔ سالار جنگ شیعہ تھے۔ آصف جاہی روایت کے مطابق مدار المہام ملک ہمیشہ شیعہ ہوا کرتے تھے۔ خاندان فخر الملک، افسر الملک، سید حسین بلگرامی، رام کشن، بال مکند وغیرہ حکومتِ وقت سے بڑی قربت رکھتے تھے۔ راجہ شیوراج آصف جاہ سادس کے مقربانِ خاص میں شامل تھے اور راجہ گردھاری پرشاد نظام کی فوج باقاعدہ کے سررشتہ دار تھے[3] خود محبوب علی خاں نے ایک بار برٹش رزیڈنٹ سے اس بات کی خواہش ظاہر کی تھی کہ ریاستی نظم ونسق کے لئے انہیں بیرون حیدرآباد عمدہ اور قابل لوگ درکار ہیں چاہے ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔

محبوب علی خاں آصف جاہ سادس نے کبھی شیعہ اور سنی کی تفریق کو پسند نہیں فرمایا۔ اس کی ایک مثال اس بات سے بھی ملتی ہے کہ آپ کی دلی خواہش اور آرزو تھی کہ اپنی دونوں ہمشیرہ زادیوں کا رشتہ ازدواج سر سالار جنگ اول کے ہونہار اور لائق

فرزندان لائق علی خاں اور سعادت علی خاں سے قائم کریں ۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے آپ نے اپنی دادی دلا ورالنساء بیگم صاحبہ اور والدہ اللہ رکھی بیگم صاحبہ کو ہموار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن دونوں خواتین راضی نہ ہوئیں ۔حضور پرنور کا مدعا پورا نہ ہوسکا ۔انہیں مایوسی ہوئی [۴]۔

آصف جاہ سادس کی رواداری نے ملک میں کبھی ہندو مسلم فسادات کو جنم لینے نہیں دیا ۔حالانکہ برطانوی حکومت کے زیرنگرانی علاقوں میں اس طرح کے فسادات بہت عام تھے ۔خود برطانوی حکومت اس چنگاری کو ہوا دیتی تھی کیونکہ ان کی حکمت عملی Divide and rule تھی ۔غفران مکان نے اس کے برعکس اس حکمت عملی کی ہمت افزائی کبھی نہیں کی ۔ ناہی بیرونی عناصر کو فسادات پھیلا کر شہر حیدرآباد کی خوشگوار فضاء کو مکدر کرنے کی اجازت دی [۵]۔

نواب افسر الملک نے ایک مسجد کی تعمیر شروع کی تھی ۔اتفاقاً اس مسجد سے قریب جہاں یہ تعمیر کی جارہی تھی ایک دیول تھا ۔ جو شاہدین کے مطابق وہاں واقع نہیں تھا بعد ازاں منتقل ہوا ۔جیسے ہی مسجد کی تعمیر شروع ہوئی ہندوؤں نے اس کی مخالفت کی اور اعلیٰ حضرت کی خدمت میں درخواستیں پیش کیں اور خواہش ظاہر کی کہ تعمیر بند کرادی جائے جیسا کہ سبھی جانتے ہیں بے تعصب حضور پرنور نے فوراً تعمیر رکوادی اور اس سے متعلق ایک فرمان نافذ کیا [۶] بظاہر یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا لیکن دوراندیش نظام نے نہ صرف اپنی رواداری کا ثبوت دیا بلکہ ایک حادثہ کو جو ہندو مسلم فساد کی شکل میں ابھر سکتا تھا بڑی خوش اسلوبی سے ٹال دیا ۔

۱۸۸۴ء میں دسویں محرم کو جو شہر میں سلطان نواز جنگ اور ان کے عرب ساتھیوں میں اہلیان کوتوالی سے تکرار کے باعث جو تباہی ہوئی تھی اس سے سبھی

واقف ہوں گے۔حکومت نظام نے شہر کے امن واماں کو بحال کرنے اورلوگوں کی
جان اور مال کی حفاظت کے لئے مکہ مسجد جیسی مذہبی عبادت گاہ کا استعمال کیا تھا۔مکہ
مسجد کی چھت پر سلطان نواز جنگ کی ڈیوڑھی کی طرف رخ کر کے ایک توپ رکھی گئی
تھی ۔انہیں خبردار کیا گیا تھا کہ مزید گڑبڑ کی صورت میں ان کو اوران کے ساتھیوں کو
توپ سے اڑادیا جائے گا۔شہر کے امن واماں میں خلل ڈالنے اور قتل وغارت گری
کے عوض میں سلطان نواز جنگ پر ایک لاکھ روپیہ جرمانہ اور شہر چھوڑنے کا حکم تھا۔
نافرمانی اور تشدد پھیلانے کی صورت میں توپ سے اڑانے کا فیصلہ تھا۔چاروں
طرف سے گھِر جانے کے باعث سلطان نواز جنگ کو ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہ
تھا۔انہوں نے اعلیٰ حضرت کے حکم کی تعمیل میں شہر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا[۷] حضور
پرنور کا حکم سنانے کے لیے ایسی نازک گھڑی میں جبکہ ہرطرف تناؤ پھیلا ہوا تھا راجہ
گردھاری پرشاد کا انتخاب کیا گیا تھا۔

موجودہ دور میں مذہب کی آڑ میں مندروں اور مسجدوں کا استعمال غلط کاموں
کے لئے ہوتا ہے۔لیکن میر محبوب علی خاں نے ایک مقدس جگہ کا استعمال صرف شہر
میں امن واماں کو بحال کرنے اورلوگوں کی جان ومال کی حفاظت کے لئے کیا۔ساتھ
ہی ان کی رواداری نے یہ ثابت کردیا کہ انہوں نے ہندو اور مسلمانوں میں فرق
محسوس نہیں کیا[۸] ایسے وقت میں جبکہ شہر میں کشیدگی پھیلی ہوئی تھی۔لوگوں کے دلوں
میں خوف ودہشت طاری تھی سب کو ایک بڑے خطرے کا خدشہ تھا۔اِس نازک
گھڑی اور تشویشناک حالات میں کسی ہندو یعنی راجہ گردھاری پرشاد کا انتخاب کر کے
انہیں ذمہ داری سونپنا صرف وہی شخصیت کرسکتی ہے جو وسیع القلب، روادار اور
تعصب سے پاک ہو

اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سابق شہر حیدر آباد ان معدودِ چند جگہوں میں سے ایک تھی جہاں ہندو اور مسلمانوں میں مکمل باہمی اتحاد اور ہم آہنگی تھی۔ آصف جاہ سادس نے کسی بھی قیمت پر اس ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب بھی رہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آزاد ہندوستان میں فرقہ واریت اور ہم آہنگی کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ سیاست دان divide and rule کی پالیسی میں زیادہ دلچسپ نظر آرہے ہیں۔ اگر وہ بھی ایمان داری، سچی لگن سے ملک وقوم کی بے لوث خدمت کریں تو ہندوستان کی کایا پلٹ سکتی ہے۔

لکھنؤ کے بعد حیدر آباد ہی ایسا دوسرا بڑا شہر تھا جہاں رواداری کی فضاء میں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ دونوں طبقے باہم شیر وشکر ہو کر قابل رشک اور امن واطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ آصف جاہ سادس کے دور حکومت میں دونوں طبقوں میں اتنا میل جول بڑھا کہ ہندو رسم ورواج مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح ہندوؤں نے بھی اپنے مسلمان بھائیوں کی بعض روایات کو اپنا لیا۔ رہن سہن، لباس، کھانے پینے، شادی بیاہ کے طور طریقے سب میں بہت زیادہ یکسانیت پائی جاتی ہے یہی وجہ تھی کہ اس دور میں اتحاد و یگانگت کا نرم و نازک پودا رواداری کی فضاء میں نشو ونما پا کر اس طرح بڑھا کہ حیدر آباد میں ایک ایسے مخلوط کلچر کا جنم ہوا جس نے ہندو اور مسلمان گھرانوں کے فرق کو مٹا دیا[9]۔

۱۸۸۴ء میں میر محبوب علی خاں نے نظم ونسق کی باگ ڈور سنبھالی تو کئی اصلاحات کیں۔ آپ نے اپنی بیدار مغزی اور قابلیت کی بنا پر جمہوری بنیادوں پر "قانونچہ مبارک" کی تدوین کی قانونچہ مبارک جاری کرنے کا اصل مقصد ان عناصر کا

تحفظ تھا جو قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دیتے ہیں۔اس قانونچہ کے ذریعہ بلا تخصیص مذہب وملت ہر طبقہ کے لئے علاحدہ اوقاف کا قیام عمل میں لایا گیا۔مختلف اوقاف کمیٹیاں بنائی گئیں۔جاگیر، انعام، سالانہ مدد و معاش نا صرف مساجد و منادر کو دی جاتی تھی بلکہ عاشور خانے، دھرم شالہ، گرجا کلیسا کرسچن مشنریز اور دوسرے ادارے بھی مستفید ہوا کرتے تھے۔ہر مذہب کے لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔حکومت نظام سے جن ہندو منادر کو امداد دی جاتی تھی ان کی تعداد مساجد سے کئی گنا زیادہ تھی[۱۰]۔

حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے سے قبل نظام ششم کلکتہ تشریف لے گئے تھے تاکہ گورنر جنرل سے ملاقات کر کے انتشار کاروبار کا بندوبست کریں اور کلکتہ میں منعقدہ نمائش بھی ملاحظہ فرمائیں اس سفر میں آپ کے ہمراہ امرائے سلطنت اور دوسرے معززین بھی شامل تھے۔اپنی رواداری کے لئے مشہور فرمانروا نے کلکتہ کے کالی مندر میں گراں قدر عطیے کے علاوہ زربفت کا شامیانہ بھینٹ کیا اور مندر کے پجاریوں کو دکشنا دی[۱۱]۔

رام نومی کا تہوار سارے ہندوستان میں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ سیکولر روایات کے مطابق حیدرآباد میں رام نومی کے موقع پر ہندوؤں کو اس تہوار کے منانے میں ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی جاتی تھیں۔آصف جاہ سادس نے بھی اپنے پیش روؤں کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے بھدراچلم کے مندر میں رام نومی کے موقع پر قیمتی موتیوں کے ہار، زیورات اور پوتر چاول بجھوائے۔یہ صرف بھگوان رام سے عقیدت کا اظہار ہی نہیں قومی یکجہتی اور رواداری کا عمدہ نمونہ بھی ہے[۱۲]۔

آپ کی فراخ دلی نے کبھی برہمنوں کی بات نہیں ٹالی۔آپ نے کئی موقعوں پر

برہمنوں کے کہنے پر منادر کو گراں قدر عطیہ اور قیمتی زیورات دیئے ۔ ہندو مذہبی رہنماؤں کو سرکار کی جانب سے رومال وشال اور پیسے دیئے جاتے تھے مذہبی رہنما پنڈت دین دیال جب چند مذہبی وعظ دینے کی غرض سے حیدرآباد تشریف لائے تو روایات حیدرآباد کے مطابق مدارالمہامِ وقت مہاراجہ کشن پرشاد نے آصف جاہ سادس کی خدمت میں ایک معروضہ پیش کرتے ہوئے عرض داشت کی کہ ''دین دیال چونکہ عالم شخص ہیں ہندوؤں نے یہاں ان کی بہت آؤ بھگت کی ہے ریاست نظام نے ہمیشہ عالموں کی بلا رعایت مذہب وملت بوقت رخصت عزت افزائی کی ہے۔ سرکار کی صلح کل کی پالیسی کو دنیا مانتی ہے آپ نے اس کی برکتوں کی نوازش کے طور پر دوشالہ دینے کی خواہش ظاہر کی''۔ میر محبوب علی خاں نے مہاراجہ کے معروضہ کو قبول کرتے ہوئے ۹/اکتوبر ۱۹۰۳ء کو یہ حکم صادر کیا کہ پنڈت دین دیال کو دوشالہ دیا جائے [۱۳]۔

اکثر مؤرخین رقم طراز ہیں کہ غفران مکان نے کئی مرتبہ برہمنوں کو عمدہ عمدہ کھانے پکوا کر کھلوائے اور ان کو نقد رقم دے کر قدر افزائی کی تھی ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کا دستِ کرم کسی ایک طبقہ کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ ہر طبقہ کے لئے یکساں تھا۔

باوجود یہ کہ حکمرانِ وقت مسلمان تھے۔ ہندو برہمنوں اور پنڈتوں سے صلاح و مشورہ کیا کرتے تھے۔ شاہی محل میں ان کی خدمات سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ حضرت اور خاندان کے دیگر افراد کے ان سے زائچے بنوائے جاتے تھے۔ شادی و دیگر مبارک موقعوں پر ان سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ زائچہ کے مطابق کچھ کمی و بیشی کی صورت میں خیر خیرات دی جاتی ، غربا کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار

ایک برہمن نے محبوب علی خاں سے عرض کیا کہ ان کا ''شنی'' خراب ہے جس کا اثر آنے والے وقت پر ہوگا۔ اس کی نحوست کو کم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنی طرف سے کسی برہمن کا انتخاب کریں اس کو ایک جوڑ سیاہ کپڑے پہننے کے لئے، ایک کالا ہاتھی اور ایک نیلم کی انگوٹھی دیں۔ محبوب علی خاں نے نہ صرف اس برہمن کی بات کا احترام کرتے ہوئے اس کی بتائی ہوئی تمام چیزیں دیں بلکہ ان کے ساتھ ایک ہزار اشرفیاں بھی دیں تا کہ آپ کے خراب ستاروں کا سایہ اس غریب برہمن پر اثر انداز نہ ہو[۱۵]۔

۱۸۹۳ء میں راجہ گردھاری پرشاد نے ایک عرض داشت حضور پرنور کی خدمت میں پیش کی اور گزارش کی کہ خود بدولت ایک بہت ہی خراب دور سے گزر رہے ہیں اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ان کا تلا دان (تقسیم کرنے والے کے ہم وزن خیرات) کرنا پڑے گا۔ آصف جاہ سادس بنسی راجہ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ آپ نے تُلا دان کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بنسی راجہ کو اجازت دے دی۔

تُلا دان کی رسم بادشاہ سلامت کی اٹھائیسویں سالگرہ سے ایک دن قبل منعقد کی گئی۔ ہندو رواج کے مطابق اعلیٰ حضرت کو تین بار تولا گیا۔ جن اشیاء سے تولا گیا ان میں چاول، دالیں، اجناس، ترکاری، قیمتی کپڑے جیسے زربفت، مشجّر، ساٹن، بلانکٹس، فرکوٹ وغیرہ وغیرہ تھے۔ آصف سادس پر سے ڈھیروں موتی نچھاور کئے گئے۔ زہرہ Venus کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ہیرے مریخ Mars کے لئے مونگے، مشتری Jupiter کے لئے پکھراج، عطارد Mercury کے لئے سونا اور زحل Saturn کے لئے نیلم سب آپ پر سے نچھاور کر کے غریبوں میں تقسیم کئے گئے۔ بعد اختتام تُلا دان حضور پرنور نے نئے کپڑے زیب تن کئے[۱۶]

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ حیدر آباد باوجود مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کی آماجگاہ ہونے کے آصف جاہ سادس نے لوگوں کے دل و دماغ میں فرقہ وارانہ جذبات پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نا سمجھ، موقع پرست، شر پسند لوگ ہی فرقہ واریت کو بڑھاوا دیتے ہیں اور مذہب کی آڑ میں جھگڑے فساد برپا کرتے ہیں۔ موجودہ ترقی پسند دور میں لوگوں کے دلوں میں جذبۂ رواداری پیدا کرنا اور ان کو باہمی اتحاد و میل ملاپ سے رہنے کی تلقین کرنا وقت کا تقاضا ہے۔

یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد کو آصف جاہ سادس سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ آپ کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ خود کو شاگردِ خاص حضور پرنور ہونے پر فخر و ناز تھا۔ آپ نے آصف جاہ سادس کی مذہبی رواداری کی پالیسی کے سلسلے میں لکھا ہے۔

''غفران مکان نے اس فقیر کو خلعت وزارت سے سرفراز فرمایا تو اپنی مدبرانہ روشن خیالی اور شاہانہ ہر دل عزیزی کے منجملہ اور نصیحتوں کے یہ بھی نصیحت فرمائی کہ ہندو مسلم میری دو آنکھیں ہیں اگر ان میں سے کسی بھی فریق کو نقصان پہنچا تو گویا میری آنکھ کو نقصان پہنچا۔ ملک کی ترقی و تہذیب کے لئے دونوں فرقوں کے اتحاد و اتفاق کو میں اپنی حکمرانی اور سلطنت کی قوت سمجھتا ہوں''[۱۷]۔

میجر جنرل سید احمد ال ادریس نے بھی اپنی کتاب Hyderabad of the seven loaves میں لکھا ہے کہ ''میر محبوب علی خاں فرقہ واریت کے جذبے سے کوسوں دور تھے۔ ان کے لئے ہندو اور مسلمان ایک جسم کی دو آنکھیں تھیں۔ وہ کسی بھی شخص کا انتخاب اس کے مذہب کی بنا پر نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی قابلیت ذہانت اور صلاحیت کو پرکھتے ہوئے کرتے تھے''[۱۸]۔

نواب میر محبوب علی خاں ایک عدل گستر، رحم پرور، فیاض، نیک دل، نیک نفس

اور نہایت بے تعصب فرمانروا تھے۔ سائل کے لئے ہر وقت مائل بے کرم رہتے تھے۔ اپنی ایک غزل کے مقطع میں خود کس سے اعتمادی سے فرماتے ہیں ؎

جو کامیاب نہ ہو کوئی یہ نصیب اس کا ہے
نہیں قبول کی آصفؔ نے التجا کسی کی

جناب محمد نور الدین خاں یوں رقم طراز ہیں کہ ''ذات والا میں بلا لحاظ مذہب و ملت انسانیت کے جذبات جلوہ فرما تھے۔ آصف جاہ سادس فقراء کی عزت فرماتے اور ان کی خدمت باعث اجر و ثواب جانتے۔ جب مدار المہام فینانس نے چند فقراء کی ماہوار کی مسدودی کی منظور چاہی تو آپ نے اپنے فرمان میں لکھا کہ فقراء سے مجھے عقیدت ہے۔ ان کی تنخواہ کی یک لخت مسدودی مجھے پسند نہیں۔ اگر مقدمات بجائے فقراء کے کسی اور کے ہوتے تو میں بخوشی آپ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے منظوری صادر کرتا۔ مناسب یہ ہے کہ مذکور فقراء دعا گو اشخاص کی تنخواہیں مدِ متفرقات سے خارج کر کے مدِ خیرات سے جاری رکھی جائیں'' [19]۔

نواب میر محبوب علی خاں اپنی رعایا کی خوشی میں خوشی محسوس کرتے ان کے تہوار جیسے عید، بقرعید، دسہرہ، دیوالی، ہولی، نوروز، نسبت پر عالیشان دربار منعقد کرتے تھے۔ جس کی مثال ہندوستان میں کہیں نہیں ملتی۔ ان درباروں میں امرائے عظام اور دوسرے معززین شرکت کرتے تھے۔ ہولی کا تہوار حیدرآباد کے سیکولر پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ آصف جاہ سادس کی دور حکومت میں آفتاب محل یا پرانی حویلی میں ہولی کا تہوار بڑے شاندار پیمانہ پر اور جوش و خروش سے منایا جاتا تھا [20]۔

یہ بھی محض اتفاق تھا کہ ایک دفعہ ہولی اور محرم کے تہوار ایک ہی دن واقع ہوئے تھے۔ محرم کا مہینہ شیعہ طبقہ کے لئے ماتم کا ہوتا ہے۔ جب کہ ہولی رنگوں کا تہوار ہے۔

ہندو گلال، ابیر اور پانی سے ہولی کھیلتے ہیں۔ اور راستہ بھر جو کوئی بھی ملتا ہے اسے رنگ لگا دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایسے ہی ایک موقع پر محبوب علی پاشاہ محرم کے ایک جلوس کی قیادت کر رہے تھے آپ نے دیکھا کہ ہولی کے متوالے گلال اڑاتے مستی بکھیرتے گلی کوچوں میں گھوم رہے ہیں۔ اس خدشے سے کہ رنگ کی چھینٹیں کہیں علم مبارک پر نہ پڑ جائیں اور رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے خود بدولت نے خاموشی سے اپنے آپ کو جلوس سے الگ کیا ہولی کے متوالوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جیسے ہی لوگوں نے آپ کو پہچان لیا سب نے بڑے ادب اور احترام سے آپ کو گھیر لیا۔ آپ نے ان سب کے ساتھ ہنسی خوشی ہولی کھیلی اور انہیں مخالف سمت میں روانہ کیا[۲۱]۔

حیدرآباد کی مشترکہ تہذیبی روایت کی پابندی امرائے وقت نے بھی کی اور ہمیشہ اتحاد اور قومی یک جہتی کو پروان چڑھانے میں حکمران وقت کا ساتھ دیا۔ یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد کے زمانے میں چندولال کی بارہ دری میں ہولی کا تہوار[۲۲]۔ خورشید جاہ کی ڈیوڑھی میں ناگ پنچمی کا میلہ، بشیر باغ پیلیس میں سر آسمان جاہ کی جانب سے تلسنکرات پر پتنگ بازی کے جلسے اور بسنت پنچمی کا تہوار ہندو اور مسلمان مل جل کر منایا کرتے تھے۔ نہایت پر تکلف ضیافت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ سر آسمان جاہ غریبوں اور ڈیوڑھی کے ملازمین میں ملبوسات تقسیم کیا کرتے تھے[۲۳]۔

رواداری کی ایک اور بے مثال یادگار بسنت پنچمی کا تہوار ہے جو حیدرآباد میں دوسرے بڑے تہواروں کی طرح بڑے پیمانے پر منایا جاتا تھا۔ اس موقع پر ہندو امراء کی جانب سے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں روایتی سامان جیسے زرد چاول، زرد پانی سے بھرے جگ مع پچکاری روانہ کئے جاتے تھے[۲۴]۔

آصف جاہ ... کی جانب سے آخری جاہ شنبہ صفر کے مہینے میں امراء اور

معززین میں سونے اور چاندی کے چھلے تقسیم کئے جاتے تھے [۲۵]۔ آم کے موسم میں آم کی تقسیم خاص الخاص حاضر باشان ڈیوڑھی مبارک، عام ملازمین ڈیوڑھی مبارک، منصبداراں، رکاب سعادت بلا امتیاز ہوا کرتی تھی۔ آصف جاہ سادس کی جانب سے رجب کے مہینے میں کونڈوں کی دعوت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس دعوت میں عام لوگ مدعو کئے جاتے تھے [۲۶]۔

حیدر آباد میں محرم کی تقاریب بھی بلا تخصیص مذہب وملت بڑے تقدس واحترام سے منائی جاتی تھیں ۔ ہندو اپنے بچوں کو سبز رنگ کے کپڑے پہنایا کرتے تھے۔ دیہاتوں سے بڑی تعداد میں لوگ خاص کر ہندو محرم کو منانے حیدر آباد آیا کرتے تھے۔ اس تقریب کو منانے میں عقیدت مندوں کی جانب سے جو تقدس واحترام کا مظاہرہ ہوا کرتا تھا وہ ان کے مسلم بھائیوں سے بڑھ کر ہوا کرتا تھا [۲۷]۔ آج بھی حیدر آباد میں محرم کا جلوس نکلتا ہے لیکن وہ رونق اور جوش وخروش کا مظاہرہ کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے مہاراجہ کشن پرشاد، راجہ راؤ رنبھا، راجہ شیوراج، رائے رایاں، بنسی راجہ اور دیگر ہندو امراء و جاگیردار محرم کی تقاریب بڑے جوش وخروش سے مناتے تھے۔ اپنی اپنی ڈیوڑھی میں علم اور تعزیے بٹھایا کرتے اور مجلس مقرر کیا کرتے تھے [۲۸]۔ غفرانِ مکان دوران عاشورہ ہر سال مہاراجہ کشن پرشاد اور راجہ شیوراج کی ڈیوڑھی پر جایا کرتے تھے [۲۹]۔

ابتداء میں دسویں محرم کے جلوس کی قیادت آصف جاہ سادس ہاتھی پر عماری میں بیٹھ کر کیا کرتے تھے۔ راستہ تمام غریبوں میں خیرات تقسیم کرتے تھے۔ بعد ازاں یہ ذمہ داری کوتوال اور دیوان کو سونپی گئی جنہیں پیسوں سے بھری تھیلیاں دی جاتیں اور غریبوں میں تقسیم کرنے کی ہدایت ہوتی ہے جن لوگوں کا قومی یکجہتی میں عقیدہ نہیں انہیں یہ

جان کر حیرت ضرور ہوگی کہ حضور پرنور نے جس دیوان اور کوتوال کو محرم کے جلوس کی قیادت کی ذمہ داری سونپی تھی وہ ہندو تھے جنھوں نے اس عافیت اندیشی اور احتیاط سے جلوس کی قیادت کی کہ ان پر غیر مسلم ہونے کا شائبہ بھی نہیں ہوسکا تھا [۳۰]۔

حیدرآباد کے کئی تہوار ایسے تھے جو دورِ آصفی میں قوم یکجہتی اور رواداری کا معیاری نمونہ پیش کرتے تھے۔ اس قسم کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملیں گی اور آج کل تو بالکلیہ معدوم ہوچکی ہیں۔ دیوالی ہندوؤں کا تہوار ہے۔ دھن تیرس کو دھن لکشمی پوجا ہندو گھروں میں بڑی عقیدت سے منائی جاتی ہے۔ لوگ اپنے گھروں کو چراغوں سے روشن کرتے ہیں۔ آصف جاہ سادس کے دورِ حکومت میں سرکاری خزانے میں بھی دھن تیرس کو دھن لکشمی پوجا ہندو رواج کے مطابق انجام دی جاتی تھی۔ اعلیٰ حضرت کی جانب سے بعد پوجا خزانے کے اکاونٹنٹ جنرل، خزانچی اور دوسرے عہدے داروں میں شال تقسیم کئے جاتے تھے۔ منتظم خزانہ، خزانے کے دوسرے ملازمین کو پگڑیاں دی جاتی تھیں اور غریبوں میں خیرات تقسیم کی جاتی تھی [۳۱]۔

دیوالی کے تہوار پر اعلیٰ حضرت کی سواری نکلا کرتی تھی۔ خود بدولت ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار ہوتے اور آپ کے ہمراہ خدمت گار، شاگرد پیشہ، خاصہ بردار، بھالہ بردار و چوبداروں کا ہجوم رہتا۔ بادشاہ سلامت کے ہمراہ گھوڑ سوار مصاحبین اردگرد ہم رکاب رہتے۔ مشعلچی چاندی کے دستے سے لیس مشعل اور خوبصورت چاندی کی کپیاں لئے آگے پیچھے دف بجھاتے تیز تیز چلتے تھے۔ سینکڑوں عرب تلوار سے کرتب دکھاتے اور بندوقیں ہوا میں فائر کرتے چلتے تھے۔ تمام رعایا دیوالی کی دھوم دھام کے بیچ اپنے محبوب بادشاہ کے دیدار کو جمع ہو جاتی تھی [۳۲]۔

حیدرآباد کی خوشحالی اور ترقی کی راہ میں ... حکومت نے کئی مزاحمتیں

پیش کیں۔ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ خودمختار ریاست اتنی ترقی یافتہ نہ ہوجائے کہ خود ان کے لئے خطرہ کا باعث بن جائے۔اس پر ستم ظریفی یہ کہ قدرت بھی اس خطۂ زمین پر نامہربان رہی۔حکومت نظام کو کئی بار خشک سالی اور سیلاب کا سامنا کرنا پڑا۔انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں پانچ دفعہ قحط کا قہر نازل ہوا۔جس کا شکار غریب طبقہ، مزدور و کسان ہوا۔قحط سے نپٹنے کے لئے ضروری اقدامات کئے جاتے تھے۔ دعاؤں، پرارتھناؤں اور نماز استقساء کا سہارا لیا جاتا۔جگہ جگہ نزول بارانِ رحمت کے لئے قرآن خوانی منعقد کی جاتی تھی۔قحط کے آثار نمودار ہونے کی صورت میں مصیبت زدہ گان کو حکومت کی جانب سے بلالحاظ مذہب وملت مدد مہیا کی جاتی تھی۔ ان کو روزگار مہیا کیا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے لئے شاہی لنگر خانے کھولے جاتے تھے۔بازاروں اور مختلف محلوں میں مصیبت زدہ گان کو کھانا کھلایا جاتا تھا[۳۳]۔ یہ حقیقت ہے کہ حکومت کی جانب سے قحط سے نپٹنے کے لئے جو احتیاطی تدابیر کی جاتیں اور قحط کے دوران جو مصیبت زدہ گان کو مالی امداد دی جاتی تھی وہ برطانوی حکومت کے زیرِ نگرانی علاقوں سے کئی گنا بہتر ہوتی تھی۔جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں لوگ نقلِ مقام کر کے نظام۔کے علاقوں میں آجاتے تھے[۳۴]۔

۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی میں طغیانی کا واقعہ حیدرآباد کی تاریخ میں صدیوں تک بھلایا نہیں جائے گا۔اس طغیانی نے وہ تباہی مچائی کہ ہزاروں بے خانماں ہوئے۔ صدہا بچے یتیم،سینکڑوں عورتیں بیوہ اور ہزاروں مردخانہ بدوش ہو گئے۔اس ہولناک سانحہ کی نظیر ابتدائے سلطنتِ دکن سے آج تک تاریخ میں نہیں ملتی۔اس بلائے ناگہانی نے ایسی تباہی مچائی کہ اہل حیدرآباد کی آنکھوں میں زمانہ تاریک ہو رہا تھا۔ اس بھیانک منظر کو دیکھنے کی آنکھوں میں تاب نہیں تھی نہیں ہر طرف مایوسی اور

بے بسی نظر آ رہی تھی۔ اس بھیانک اور ہولناک سانحہ کے باوجود مایوس اور نا امید دلوں میں روشنی کی کرن انہیں ذاتِ شاہانہ میں نظر آ رہی تھی۔ انہیں اس بات کا علم اور احساس تھا کہ ان کا ہر دل عزیز فرمانروا ان کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہے۔ اس عقیدہ اور بھروسہ کی وجہ یہ تھی کہ خود بدولت اپنی رعایا کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ وہ قدرت کے اس ناگہانی قہر سے بیحد متاثر تھے پل پل کی خبر کے لئے بے چین و مضطرب تھے۔ مقامِ حادثہ پر اپنی رعایا کی تکالیف دیکھ کر آپ کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ نکلے[۳۵]۔

دیکھ کر ویرانگی آنسو بہائے برملا

نرم دل بادشاہ اتنے متاثر اور رنجیدہ ہوئے کہ آنسو زار و قطار بہہ نکلے اور وہ کچھ کہہ نہیں پائے۔ حضور پرنور کی پُر خلوص مداح شریمتی سروجنی نائیڈو نے اس حادثہ کو ''The Tears of Asif'' کے نام سے ایک نظم کی شکل میں بیان کیے ہیں[۳۶]۔

ایک کشادہ، فراخ دل اور بے تعصب فرمانروا جو مکمل انسان تھا جو اپنی رعایا کے دکھ درد کو سمجھتا تھا اکثر و بیشتر راتوں میں بھیس بدل کر شہر کی صورت حال کا جائزہ بہ چشم خود لیا کرتا تھا۔ وہ اپنی رعایا سے یوں مخاطب ہے ۔

آصف کو جان و مال سے اپنی نہیں دریغ
گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے[۳۷]

رعایا کی تباہ حالی کو دیکھ کر آپ اتنے متاثر ہوئے کہ پنڈتوں کے مشورہ پر بپھری ہوئی ندی میں اتر کر پوجا کی اور آرتی اتاری، اس کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لئے بھگوان سے پرارتھنا کی[۳۸]۔ اپنی رعایا پروری اور انسانی ہمدردی کے ناطے بے خانماؤں کی رہائش کے لئے پنج محلّہ اور اپنی حویلی کو وقف کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

پردہ دار خواتین کے لئے علیحدہ انتظامات کئے گئے۔ اندرون اور بیرون شہر حیدرآباد میں ہندو اور مسلمانوں کے لئے ہزاروں روپیئے کے مصارف سے کھانے تقسیم ہوئے۔ ملازمین کو پیشگی تنخواہیں دی گئیں۔ دفاتر بند رکھے گئے۔ مصیبت زدہ گان کی امداد کے لئے سرکاری خزانے سے دل کھول کر اخراجات کئے گئے۔ خود آصف جاہ سادس نے اس کار خیر میں چار لاکھ روپیہ کی مالی امداد دی[39]۔ اس طرح اپنی ہمدردی، نوازش اور رواداری کی عمدہ مثال قائم کی۔ مصیبت زدہ گان کے لئے ریلیف کمیٹیاں بنائی گئی تھیں۔

درحقیقت میر محبوب علی خاں کا دور قرون وسطیٰ سے نکل کر عصر جدید کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جس میں تغیرات کا رونما ہونا لازماً اور ضروری تھا۔ ان تغیرات کی اہمیت اور پچھڑے پن کو دور کرنے کی غرض سے زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلیوں کی ابتداء ہوئی، حیدرآباد میں تعلیم کا فقدان تھا نظام ششم نے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے علم وادب کی شمع کو گل ہونے نہیں دیا۔ فارسی کی جگہ اردو زبان کو رائج کیا گیا۔ اردو زبان کے فروغ میں ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر نمایاں حصہ لیا[40]۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد بڑے بڑے ادیب، انشاء پرداز اور شاعروں کا مرجع بن گیا۔ ایک شاعر کی حیثیت سے خود بدولت نے علم وادب کی ترقی میں بلا تخصیص ہمت افزائی کی۔ ہندو اور مسلمان شاعروں اور ادیبوں کو وظیفہ مقرر کیا۔ اشاعت وطباعت میں مالی امداد دی۔ لکھنؤ اور رام پور کے بعد کئی بیرونی شاعروں نے حیدرآباد کا رخ کیا جنہیں شاہی سرپرستی حاصل رہی۔ داغ دہلوی، امیر مینائی، الطاف حسین حالی، مولانا شبلی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور دوسری کئی ہستیاں تھیں جنہوں نے یہاں ملازمت کی، شاہی سرپرستی، عنایات اور مہمان نوازی کا لطف اٹھایا[41]

تعلیمی معیار کو بڑھانے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تعلیم کی اہمیت سے واقف کرایا گیا۔ اسکول اور کالجس کھولے گئے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا علیحدہ انتظام کیا گیا۔ ترقی علم وفن میں ہمیشہ آپ کا دست کرم کھلا رہا۔ صرف حیدرآباد ہی نہیں علی گڈھ کالج، مختلف تعلیمی ادارے، انجمنیں اور نادار طلباء اقطائے ہند کے لئے وظائف جاری کئے گئے [۴۲]۔

حیدرآباد میں جنم لینے والی ممتاز و مایہ ناز ہستی جس نے نہ صرف اپنے وطن میں شہرت پائی بلکہ سارے ہندوستان میں ''Nightingale of India'' کے نام سے مشہور ہونے والی سروجنی نائیڈو تھیں۔ آپ انگریزی زبان کی مشہور و معروف شاعرہ تھیں۔ آپ سرزمین حیدرآباد میں پلی بڑھیں اور تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں غفران مکان کی نظرِ عنایت سے ۳۰۰ پونڈ سالانہ کی اسکالرشپ پر ۱۸۹۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن بھیجی گئیں [۴۳]۔

حکومت نظام کی طرف سے ۱۸۸۸ء اور بعد ازاں ۱۸۹۶ء میں دو کلوروفارم کمیشن قائم کئے گئے [۴۴]۔ ان پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا گیا۔ اس کمیشن نے متعدد تجربات کے ذریعہ کلوروفارم کے اثرات کا پتہ لگانے کی کوشش کی [۴۵]۔

آصف جاہ سادس میر محبوب علی خاں کی رعایا میں مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاتا ہے کہ رعایا آپ کو، ولی اور اوتار کا درجہ دیتی تھی۔ آپ کی شخصیت نے آپ کے مساویانہ سلوک سے ماحول اور خاص طور پر عام آدمی کو اتنا متاثر کیا ہے کہ اس ہر دل عزیز والیٔ ریاست سے جڑے متعدد واقعات قصہ کہانیوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں آپ کی وفات کے برسوں بعد بھی ان کی صدائے بازگشت آج بھی سنی جا سکتی ہے۔

حیدرآبادی، محبوب علی پاشاہ کی روحانی طاقت کے بہت قائل تھے۔ وہ سانپ کے کاٹے کے عامل تھے آپ کے عمل سے سانپ کا زہر زائل ہو جاتا تھا۔ اس کے

لئے حکم تھا کہ آدھی رات کے وقت بھی ہر کسی کے لئے محل کے دروازے کھلے رکھے جائیں اور سانپ گزیدہ کو کسی بھی وقت رسائی ملنی چاہیے۔ آپ کے نام میں وہ تاثیر ہے کہ سانپ نکلنے پر جب یہ کہا جاتا ہے کہ "محبوب علی پاشاہ کی دہائی ہے"[۴۶]۔ سانپ بغیر نقصان پہنچائے اپنا راستہ بدل دیتا ہے۔ آج کل لوگ اس بات پر یقین نہیں کریں گے لیکن میری خود آزمائی ہوئی ہے۔ اعلیٰ حضرت کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوسکتا ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں ہندوؤں نے بھی اپنے بچوں کے نام محبوب علی پاشاہ کے نام پر رکھے۔ جیسے محبوب کرن، محبوب رائے، محبوب راج، محبوب نارائن، محبوب ریڈی وغیرہ۔ محبوب راج اور محبوب نواز ونت کا خطاب خود آصف جاہ سادس نے عنایت فرمایا تھا۔

عظمت شان، سطوت وجلال، شجاعت وسخاوت اور بیدار مغزی جیسی صفات کے حامی نواب میر محبوب علی خاں نے عوام کو موت کی غارت گری، قتل وخون اور انتشار سے نکال کر خوش حال زندگی عطا کی۔ امن وامان بحال کیا۔ فیاضی کی دولت لٹائی۔ اپنی مذہبی رواداری سے اتحاد اور یکجہتی کو فروغ دیا۔ لوگوں کے دلوں کو تلواروں کے زور سے نہیں بلکہ عاملانہ برتاؤ، التفات والفت اور جذبہ رواداری سے مسخر کیا۔ اپنی انہی خوبیوں کے باعث وہ عوام میں محبوب بن گئے۔ اپنے محبوب فرماں روا کے لئے آج بھی ان کے دلوں میں وہی جذبہ اور احترام ہے۔ ان کا نام آج بھی عزت سے لیا جاتا ہے جس نے حیدرآباد کو بہت کچھ دیا لیکن اپنے قول سے کبھی نہیں پھرا۔

آصف تو کبھی قول سے اپنے نہیں پھرتا
وہ اور کوئی ہوگا کہا اور کیا اور

میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا حیدرآباد جس کے نام اور جس کی یاد کو

آج بھی لوگوں نے اپنے دلوں سے لگائے رکھا ہے ان کی مقبولیت لازوال ہے۔ حیدرآباد کے گیتوں اور کہانیوں میں محفوظ ہے جس پر آپ نے بڑی شان وشوکت اور سطوت وجلال سے حکومت کی۔

سابق حیدرآباد کی حیثیت اس چمن کی سی تھی جس کے ہر پھول کی رنگینی اور خوشبو نے نہ صرف حیدرآباد بلکہ باہر سے یہاں آنے والوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ یہاں کی مشترکہ تہذیب وشائستگی، انسان دوستی اور رواداری نے اس شہر کو سارے عالم میں مشہور اور سربلند کیا ہے۔ اس شہر کی اعلیٰ روایات شان وشوکت، عظمت، امارت، دبدبہ، سماجی اور معاشی حالات، اخلاقی اور سوشیل رجحانات نے اس کی شہرت میں چار چاند لگائے ہیں۔ حیدرآبادی داد ودہش، سخاوت ومروت، وضع داری وشائستگی، ہندو مسلم اتحاد و بھائی چارگی عدیم المثال ہے۔ ان ہی تمام خوبیوں نے دونوں فرقوں کو ایک کر کے دوئی کے فرق کو مٹا دیا تھا۔ راجہ نرسنگھ راج عاؔلی نے سچ کہا تھا۔

حق والو بتاؤ حرم و دیر کہاں
جب ایک وطن میں ہو تو پھر بیر کہاں
خالق دونوں کا جب نہیں دو عاؔلی
ہندو مسلم ہیں ایک، غیر کہاں

سابق حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب وشائستگی، انسان دوستی اور رواداری کی ہم نے وہ خوبصورت تصویر دیکھی جو بہت جاذب نظر اور دل لبھانے والی ہے۔ ماضی کے قصہ، کہانیاں اور روایتیں کانوں کو سننے میں بہت بھلی لگتی ہیں کیونکہ ان میں تہذیب، رواداری اور کردار کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ تاریخی اعتبار سے ان کی اہمیت چاہے ہو نہ ہو لیکن اس سرزمین پر جنم لینے والی ہندو اور مسلمان ہستیوں نے اس گنگا جمنی تہذیب کو

پروان چڑھانے میں اپنے فرمانرواؤں کا ساتھ دیا اور آنے والی نسل کے لئے ایک گراں قدر اور بیش بہا خزانہ ورثہ میں چھوڑا۔ موجودہ حیدرآباد میں اب نہ وہ اہل محفل رہے اور نہ وہ محفلوں کی رونق باقی رہی کیوں کہ وہ تمام ہستیاں آج اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی ہیں۔ یہ درخشاں اور روشن ستارے بظاہر اب غروب ہو چکے ہیں لیکن حقیقتاً وہ زندہ جاوید ہیں۔ کیوں کہ ان کی چھوڑی ہوئی روایات سبق آموز ہیں۔ ان بزرگ ہستیوں کی مثالی زندگی کو سامنے رکھ کر ان کے نقش قدم پر چل کر بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ اور عصر حاضر میں ان کے سیکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ تصویر کے اگر دوسرے رخ پر ہم نظر ڈالیں تو ہم کو اس کے رنگ پھیکے پڑتے نظر آئیں گے۔ کیونکہ جدید تہذیب سابق حیدرآبادی تہذیب پر بہت زیادہ اور تیز رفتاری سے اثر انداز ہو رہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم حیدرآبادی روایات اور اجتماعی اخلاق کو نہ مٹایا جاسکتا ہے اور نہ ان کو فراموش کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان کے نقوش بہت واضح اور گہرے ہیں۔

بیسویں صدی میں میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا حیدرآبادی معاشرہ قومی یک جہتی اور رواداری کی رنگین اور خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے جو اپنے آپ میں بے مثال تھا۔ انیسویں صدی کے مقابلے میں موجودہ ہندوستانی معاشرت میں یکجہتی اور رواداری کا فقدان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل تعصب یا Fanaticism کی بہت حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے۔ یہاں اس تہذیب یافتہ اور مہذب معاشرہ میں متعصب اور کینہ پروروں کو نظر انداز کرنا ہی وقت کا تقاضا ہے۔ سیکولرازم کے لئے ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی کی جڑوں کو مضبوط کرنا بے حد ضروری ہے کیونکہ ثقافت اور اتحاد قومی یک جہتی اور رواداری کے دو طاقتور اور استوار ستون ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ K. Krishna Swamy Mudiraj، Pictorial Hyderabad , Vol.1، چندر کانت پریس۔حیدر آباد۔۱۹۲۹ء۔ص ۴۔

۲۔ وی کے باوا۔ Hyderabad in Transition under Salar Jang۔ پچی گن۔ ٹلانے یونی ورسٹی۔۱۹۶۷۔ص ۱۵۵۔۱۵۸۔

۳۔ کے۔چندریا۔شہر محبت حیدر آباد کے لئے چیلنج فرقہ وارانہ فسادات، روزنامہ سیاست، حیدر آباد۔

۴۔ ڈاکٹر شیلا راج۔توشۂ عاقبت۔ہندوستان پرنٹرس۔بمبئی۔۱۹۸۴ء۔ص ۱۲۵۔۱۲۷۔

۵۔ ڈاکٹر شیلا راج Communal Peace During the Nizams۔روزنامہ دکن کرانیکل۔سکندر آباد ۶ رفبر وری۔۱۹۸۳ء

۶۔ محمد نصیر الدین ہاشمی۔المحبوب۔حیدر آباد ۱۹۹۶ء۔ص ۹۳۔۹۴

۷۔ افسر الملک کارنامۂ سروری۔نظام المطابع۔حیدر آباد۔۱۹۰۲ء ص ۱۶۵۔۱۸۱

۸۔ ڈاکٹر شیلا راج Hyderabad In the Days of the Nizams , 1828 - 1896، منروا پریس۔لندن، ۱۹۹۶ء ص ۶۵۔۶۶

۹۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر۔کارنامہ سروری، مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ۔

۱۹۳۳۔ص ۱۱

۱۰۔ غلام صمدانی خاں گوہر۔ تزک محبوبیہ۔ حصہ اول۔ فخر نظامی پریس، حیدرآباد۔۱۹۰۱ء۔ص ۳۶۵

۱۱۔ شیلا راج۔ توشہ عاقبت۔ بحوالہ بالا۔ص ۔۱۱۰۔

۱۲۔ لیس ہیرالال موریا۔ رام اور رامائن۔ روزنامہ سیاست۔ حیدرآباد۔۱۳ر اپریل ۱۹۸۱ء۔ص ۔۵

۱۳۔ ڈاکٹر سید داؤد اشرف۔ حاصل تحقیق۔ شگوفہ پبلیکشنز۔ حیدرآباد۔۱۹۹۲ء ص ۔۹۷

۱۴۔ سید محی الدین جیسی حافظ۔ شاہانِ آصفیہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی۔ ماہنامہ سب رس۔ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ حیدرآباد۔ سپٹمبر ۱۹۶۷ء۔ص ۔۲۸

۱۵۔ لئٹن اور راجن The Days of the Beloved۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیو پریس۔ لندن۔1974ء۔ص ۸۰

۱۶۔ راجہ گردھاری پرشاد۔ روزنامچہ ۱۸۹۴ء۔ ص ۲۷۔۲۸

۱۷۔ سید محی الدین جیسی حافظ۔ سب رس۔ بحوالہ بالا۔ص ۲۸

۱۸۔ میجر جنرل سید ال ادریس۔ Hyderabad of the Seven Loaves۔ بنگلور۔۱۹۶۲۔ص ۵۴

۱۹۔ محمد نورالدین۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان فرامین کی روشنی میں۔ روزنامہ سیاست۔ حیدرآباد۔

۲۰۔ ڈگمبر راؤ۔ ہولی کا تہوار حیدرآباد میں۔ روزنامہ سیاست۔ حیدرآباد۔

مارچ ۱۹۷۲ء

۲۱۔ لٹن اور راجن The Days of the Beloved۔ ص ۷۹

۲۲۔ نصیر الدین ہاشمی۔ مہاراجہ چندولال کی بارہ دری۔ شہر حیدرآباد۔ روزنامہ سیاست ۱۹۷۸ء۔ ص۔ ۹۰

۲۳۔ بشیر باغ میں بسنت کی تقریب۔ روزنامہ سیاست۔ حیدرآباد۔ ۱۸؍ ستمبر ۱۹۷۸ء۔ ص ۵

۲۴۔ Chronology of Modern Hyderabad۔ سنٹرل رکارڈ آفس۔ حیدرآباد۔ ۱۹۵۸ء۔ ص ۸۵

۲۵۔ عنایت نامہ میر محبوب علی خاں نظام ششم بنام راجہ گردھاری پرشاد۔ مورخہ ۲۱؍ نومبر ۱۸۸۴ء

۲۶۔ جیون یار جنگ سوانح عمری سرور جنگ۔ My Life۔ آرتھر اسٹاک ویل لمیٹڈ۔ لندن۔ ص ۱۲۔۱۳

۲۷۔ T.Vedantam، Censes of India۔ حیدرآباد میں محرم۔ حیدرآباد۔ ص ۲۴۔۲۶۔

۲۸۔ Censes of India - 1971۔ بحوالہ بالا۔

۲۹۔ راحت عزمی۔ حیدرآباد کا محرم۔ روزنامہ سیاست۔ حیدرآباد۔ ۱۱؍ ڈسمبر ۱۹۸۷ء

۳۰۔ لٹن اور راجن۔ بحوالہ بالا۔ ص۔ ۷۸۔۷۹۔

۳۱۔ مشیرِ دکن۔حیدرآباد۔۲۴راکتوبر۔۱۹۰۳ء

۳۲۔ رمن راج سکسینہ۔تذکرہ دربار حیدرآباد۔ترقی اردو بیورو۔نئی دہلی۔۱۹۸۸ء ص۱۹۹۔۲۰۰

۳۳۔ میر دلاور علی دانش۔ریاضِ مختاریہ، اعظم اسٹیم پریس۔حیدرآباد۔۱۹۴۲ء۔ ص۔۲۲

۳۴۔ ڈاکٹر شیلا راج۔Mediaevalism to Modernism
Popular Prakashan۔ممبئی۔۱۸۸۷۔ ص۔۱۳۵۔۱۳۶۔

۳۵۔ مولوی سید محمد حسین اغلب۔ بہار و خزاں حیدرآباد۔ مطبع مشیرِ دکن۔ حیدرآباد۔۱۹۰۸ء۔ص۷۶

۳۶۔ ظہیر احمد۔Life's Yesterday۔تھاکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔بمبئی۔۱۹۴۵ء۔ ص۱۳۷

۳۷۔ مولوی سید عبدالخالق۔ مرقع عبرت عرف بھاگ وتی۔ مطبع مراد دکن۔ حیدرآباد۔۱۳۲۶ھ۔ص۔۲۲

۳۸۔ ڈاکٹر شیلا راج۔بحوالہ بالا۔ص۱۳۷

۳۹۔ نیشنل آرکیوز آف انڈیا۔حیدرآباد کے اہم واقعات۔ رزیڈنٹ کی طغیانی پر رپورٹ۔۱۹۰۹ء۔ص۔۷

۴۰۔ اسلامک کلچر The Deccan's Contribution to Indian
Culture۔حیدرآباد۱۹۳۶ء۔ص۔۴۳۰

۴۱۔ رام بابو سکسینہ۔ اردو ادب کی تاریخ۔ مطبع رام نارائن لال۔ الہ آباد۔ ۱۹۲۷ء۔ ص۔ ۱۹۹

۴۲۔ مملکتِ آصفیہ حصہ اول۔ ادارہ محبان دکن۔ کراچی۔ ۱۹۷۸ء ص ۳۳

۴۳۔ جریدہ روزگار۔ ۹/مارچ ۱۸۹۵۔ ص ۳

۴۴۔ سرآسماں جاہ۔ مدارالمہام حیدرآباد۔ کلوروفارم کمیشن کی رپورٹ۔ بمبئی۔ ٹائمس آف انڈیا اسٹیم پریس۔ ۱۸۹۱ء۔ ص۔ ۱

۴۵۔ نیشنل آرکیوز آف انڈیا۔ Internal - 13 - F.D.۔ فبروری۔ ۱۸۹۰ء نمبر س ۱۱۵/۱۲۶ Arrangements Connected with Hyderbad Chloroform Commission.۔ ص ۲۹

۴۶۔ Lynton & Rajan۔ بحوالہ بالا۔ ص ۷۵۔ ۷۶

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع

۱۹۴۸ء۔۱۹۱۱ء

میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی رواداری

۱۷۲۴ء میں نظام الملک آصف جاہ اول نے دکن میں اپنی خود مختار مملکت قائم کی۔ آپ اعلیٰ درجہ کے سپہ سالار اور مدبر انسان تھے۔ آپ کے مفادات ملک سے وابستہ تھے۔ ملک کے مفاد کے آگے اپنے اور پرائے میں آپ نے فرق نہیں کیا۔ آپ نے اپنی سلطنت کی عمارت عدل و نظم اور رواداری کی بنیادوں پر کھڑی کی۔ آپ نے اپنے دبدبہ، جلال، شخصیت اور اقبال کی بدولت کئی ایسے عناصر کو سر اُٹھانے کا موقع نہیں دیا جن کے اٹھنے سے ملک میں بد نظمی اور امن و امان کو خطرہ تھا۔ آصف جاہ اول کی وفات کے بعد جانشینی کے جھگڑے نے طول پکڑا اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔ انگریزوں کے ساتھ فرانسیسیوں نے بھی دکن میں اپنا اثر بڑھانا شروع کیا۔ ملک افراتفری اور بد نظمی کا شکار تھا ایسے میں ۱۷۶۳ء میں میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے امورِ سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی اور اپنی خوش تدبیری سے دولتِ آصفیہ کو زوال سے بچایا، مزید استحکام بخشا اور اس کے وجود کو برقرار رکھا۔ آپ کے جانشین سکندر جاہ ثالث اور ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کے عہدِ حکومت میں ریاست کے معاملات میں انگریزی رسوخ بہت بڑھ گیا اور انہوں نے سلطنت کے نظم و نسق میں بے جا مداخلت شروع کر دی تھی۔ ۱۸۰۳ء سے ۱۸۲۹ء تک ہونے والے معاہدوں پر انگریزوں نے کبھی عمل نہیں کیا بلکہ ہر بار معاہدہ شکنی ہوتی رہی جس کی وجہ سے حیدرآباد کی خارجی اور

مالی حکمت پر بُرا اثر پڑا اور سلطنت سخت معاشی بحران کا شکار رہی۔ افضل الدولہ آصف جاہ خامس اور میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا دور ایک اہم دور تھا اس دور میں کئی اصلاحات ہوئیں۔ میر محبوب علی خاں کے دور کے اختتام تک ملک نے زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی۔ بلاشبہ میر محبوب علی خاں کا دور ایک تغیراتی دور تھا جو جدیدیت کی طرف گامزن تھا۔ ۱۹۱۱ء سے عہد عثمانی کی شروعات ہوئی۔ آپ کے دور میں تہذیب وتمدن نے بہت ترقی کی کیونکہ آپ کے مدِ نظر ہمیشہ ملک کی ہمہ جہتی ترقی تھی۔

دورِ عثمانی کو نظم ونسق کے معاملہ میں کئی امور میں اولیت وفوقیت حاصل رہی۔ حیدرآباد ہندوستان کی وہ پہلی اور واحد ریاست تھی جہاں ایسی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تھا جس میں قدیم، مشرقی ومغربی علوم وفنون کا امتزاج تھا۔ جس کا ذریعہ تعلیم اُردو زبان تھا۔ حیدرآباد وہ پہلی ریاست تھی جہاں محکمہ آرائش بلدہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ شہر کی آرائش وتزئین سے متعلقہ تمام امور کی دیکھ بھال اسی محکمہ کے تحت تھی۔ اس محکمہ کا اہم کام جھونپڑپٹی کی صفائی اور کم آمدنی والے طبقات کے لئے مکانات کی تعمیر بھی تھا۔ عدلیہ کی عاملہ سے علاحدگی میں بھی حیدرآباد نے پہل کی۔ ایسے اصلاحی کام ایک فرلیس اور دوراندیش شخصیت ہی انجام دے سکتی ہے[1]۔

میر عثمان علی خاں آصف سابع کی فطرت میں صداقت تھی۔ آپ کو ظاہری اور نمائشی چیزوں سے سخت نفرت تھی۔ آپ نہایت سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ ہندوستان کی بڑی ریاست کے فرمانروا ہونے کے باوجود آپ نے اپنی زندگی کو نمونے کے طور پر پیش کیا۔ فضول خرچی پسند نہ تھی۔ آپ نے اعلیٰ طبقہ میں معمولی معمولی موقعوں پر پانی کی طرح پیسہ بہانے کی عادت اور فضول خرچی کے انسداد کی

جانب توجہ فرمائی۔ اس سلسلے میں آپ نے کوئی فرمان صادر نہیں فرمایا بلکہ خود بدولت نے ہی فضول خرچی سے احتراز کر کے لوگوں کے آگے مثال قائم کی[۲]۔ کئی ایسی قابلِ اعتراض اور ناشائستہ سرگرمیاں جیسے دعوتیں، ناچ اور موسیقی کی محفلیں جو اعلیٰ عہدہ داروں کے دوروں کے دوران اہتمام کی جاتی تھیں انہیں بند کرنے کا نہ صرف حکم دیا بلکہ نافرمانی کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کے ہدایت بھی کی[۳]۔

فضول خرچی کا انسداد تقاریب میں بیجا اور غیر ضروری مصارف کی روک تھام، زندگی میں سادگی یہ سب اسی خوش اقبال اور بلند پایہ ہستی کے عمل کا ہی نتیجہ تھیں جس کی تقلید اور پیروی کر کے ریاست حیدرآباد نے اپنے آپ کو دوسروں کے دستِ نگر ہونے سے بچا رکھا تھا۔ راجہ نرسنگھ راج عالیؔ نے آصف سابع کی سادگی سے متاثر ہو کر سناتن دھرم کی جانب سے منعقدہ میر عثمان علی خاں کی جشن جوبلی کے جلسہ میں اپنی ایک تقریر میں کہا ''اب کہاں ہیں وہ ہستیاں جو اپنی رعایا اپنی اولاد اپنے اعزا اپنے امراء کی خاطر دنیا بھر کی نعمتیں موجود رکھتے ہوئے خود کو سادہ زندگی کا نمونہ بنائیں اور ایسی نظیر قائم کریں جس کو پیش کرنا ممکن ہی کیا محال ہے شاید ایسی ہی لاجواب نظیر کے لئے بھگوان سری کرشن نے ہندوؤں کی مقدس کتاب بھگوت گیتا میں یہ فرمایا ہے کہ بڑے لوگ جو کام کرتے ہیں وہ نمونے کے ہوتے ہیں اور چھوٹی ہستیاں اس کی تقلید کر کے اپنی زندگی کو خوشحال بناتی ہیں۔ حیدرآباد ایک بیدار مغز کامیاب حکمراں کی حکمرانی کی خوش آئند برکات کے باعث ترقی و خوشحالی کے راستہ پر گامزن ہے''[۴]۔

آصف سابع کے یہاں دیگر مہاراجۂ ہند کی طرح ٹھاٹھ باٹ تھے نہ لباس شاہانہ تھا نہ جواہرات پہنتے تھے۔ لباس اوسط درجہ کا تھا۔ آپ کفایت شعار تھے اور یہ

کفایت شعاری صرف آپ کی ہی ذات تک محدود تھی۔ اپنی کفایت شعاری کے باعث لوگوں کی نظروں میں کنجوس اور بخیل سمجھے جاتے تھے۔ آپ نے اپنے معتمد پیشی سے موسم سرما میں ایک کمبل خرید کر لانے کے لئے کہا کیونکہ آپ کا کمبل بوسیدہ ہو چکا تھا۔ آپ نے اس بات کی تاکید کی کہ کمبل کی قیمت پندرہ روپیہ سے زائد نہ ہو۔ یہ جان کر کہ بازار میں کمبل کی قیمت اٹھارہ روپیہ ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ موسم سرما تو اسی کمبل میں گزر جائے گا آئندہ سال دیکھا جائے گا[۵]۔ اس گفتگو کے چند لمحوں بعد ہی امامِ جامع مسجد دہلی باریاب ہوئے اور جامع مسجد دہلی کے صحن کے فرش کے چوتھائی حصہ کی تعمیر کے لئے دستِ سوال دراز کیا جس کا تخمینہ چار لاکھ روپیہ تھا۔ امام کی بات سن کر اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ چوتھائی حصہ کی تعمیر کرانا ایسا ہی ہوگا جیسے کمخواب میں کھدر کا پیوند لگانا۔ آپ نے فوراً حکم صادر فرمایا کہ خزانے شاہی سے صحن مسجد کا پورا فرش از سر نو تعمیر کرنے کے لئے سولہ لاکھ روپیہ ادا کر دیئے جائیں۔ اپنی ذات کے لئے آپ کو اٹھارہ روپیہ کا خرچ بھی گوارا نہ تھا لیکن دین کی خدمت کے لئے تھیلیوں کے منہ کھول دیئے[۶]۔ یہ تھے وہ تاجدار دکن جنہوں نے ایسی مثال قائم کی جو تاریخ کے صفحات میں آج بھی زندہ ہے۔

میر عثمان علی خاں اسی طرح اپنے فرزندوں اعظم جاہ اور معظم جاہ سے بھی سادگی کی توقع رکھتے تھے۔ وہ نہایت روادار تھے۔ امیری غریبی اور اونچ نیچ کے فرق کو دور کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ عام رعایا اور اپنی اولاد میں فرق نہیں رکھتے تھے۔ ایک بار رمضان کی عید کے موقع پر آپ نے اعظم جاہ کو ان کے پرانے کپڑے دھلوا کر خادموں کے ہاتھ روانہ کیا اور کہلوایا کہ ان کپڑوں کو عید کے دن پہن کر نماز ادا کریں اور سادگی سے عید منائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ اعظم جاہ کی فضول خرچی سے

سخت نالاں تھے۔اعلیٰ حضرت کا پیام لے کر قاصد اعظم جاہ کے پاس پہنچا اور کپڑے پیش کئے۔اعظم جاہ نے فوراً ان کپڑوں کو واپس کر دیا اور قاصد سے کہا کہ وہ حضور نظام سے کہے کہ ''میں یتیم نہیں ہوں۔میرے سر پر والد محترم کا سایہ موجود ہے لہذا میں یہ کپڑے نہیں پہن سکتا۔والد محترم یتیم ہیں وہ چاہیں تو پرانے کپڑے پہن سکتے ہیں۔'' اس بات کو سن کر حضور نظام ناراض نہیں ہوئے آپ نے نا صرف اعظم جاہ کے لئے کپڑے بنوائے بلکہ رواداری کی مثال قائم کرتے ہوئے دکن کی رعایا کے سرپرست کی حیثیت سے ہزاروں لاکھوں غریب و نادار لوگوں میں بھی نئے کپڑے تقسیم کئے اور عید رمضان بڑی دھوم دھام سے منائی گئے۔

اگر چہ کہ یہ طرز زندگی صرف آپ کی ذات سے وابستہ رہا لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ اتنی سادگی اور کفایت کیا ہندوستان کی ایک بڑی ریاست کے مالک اور ایک ذی جاہ حکمران کے لیے بجا تھی۔کیونکہ اس ریاست کی عظمت و وقار، شان و شوکت، مرتبہ اور حیثیت سب آپ کی ذاتِ والا سے جڑے تھے۔اور آپ کا شمار دنیا کے امیر ترین فرمانرواؤں میں تھا۔آصف جاہی جاہ و جلال، شان و شوکت جو میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے دورِ حکومت میں بامِ عروج پر تھی جن کے عہد کو تاریخ کا سنہری دور مانا جاتا تھا۔جو صاحبِ دل کہلاتے تھے جن کی داد و دہش آج بھی لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ایسے میں ظاہر ہے کہ میر عثمان علی خاں کو ان کے برعکس پاکر لوگ آپ کو بخیل سمجھتے ہوں گے۔جہاں تک میرا اپنا سوال ہے میری ذاتی رائے ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ کفایت شعار تھے۔ویسے بھی لوگوں کی اپنی اپنی ذہنیت ہے۔اپنا اپنا خیال ہے جس ڈھنگ سے سوچتے ہیں اسی ڈھنگ سے نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ان لوگوں کے لئے ہی مرزا یاس یگانہ نے کہا تھا۔

نکالے حسن میں سو عیب، عیب میں سو حسن
خیال ہی تو ہے جیسا بندھے جدھر گزرے

آصف جاہ سابع حیدرآبادیوں کے لئے شاہی اور مطلق العنانی کی آخری یادگار میں سے تھے آپ غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ صاحبِ دماغ انسان تھے۔ ملک میں درپیش سیاسی دھاروں سے انہوں نے اپنے آپ کو الگ نہیں کیا۔ آپ کو صرف اپنے عہد کی فکر نہیں تھی بلکہ تغیرات کے مدِ نظر آپ مستقبل پر بھی نظر رکھتے تھے۔ وقت کے دھاروں کے ساتھ بہتے ہوئے اپنے پیش رووں کی قائم کردہ روایات میں تبدیلیوں کے ساتھ ان پر عمل پیرا رہے۔ نسلاً چلی آرہی رواداری کی روایت کو ہمیشہ دھیان میں رکھا۔ آپ کے یہاں بھی تقسیم اعزازات، مناصب، جاگیر وادائیگی جواہر وخلعت میں کبھی ہندو اور مسلمانوں میں امتیاز نہیں برتا گیا۔ اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی آپ نے مہاراجہ کشن پرشاد کو جواہر سرفراز فرمائے[8]۔

کسی بادشاہ کا عوام کے دلوں پر حکومت کرنا اور رواداری جتانے کا مطلب صرف یہ نہیں کہ وہ بڑی قابل قدر اور وسیع معلومات کی شخصیت ہوگی بلکہ اُس شخصیت کا نیک، مستحکم اور عدیم المثال عمل ہے جو لوگوں کے دلوں کی گہرائی کو چھو لیتا ہے اور جس کا نقش دیرپا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی رعایا کا ہر طبقہ چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو ایسے ذیجاہ بادشاہ سے بے حد خوش رہے گا۔ آصف جاہی سلطنت کی یک جہتی، عوام دوستی اور رواداری حیدرآباد کی امتیازی خصوصیت رہی لیکن اپنے دور میں میر عثمان علی خاں نے غیر مسلموں سے رواداری کی ایسی مثال قائم کی جو اپنی نظیر آپ تھی۔ آپ نے مسجدوں، چرچوں، مندروں، گرودواروں، عاشور خانوں، اور درگاہوں کی نگہداشت کے لئے عطیہ جاری کئے۔ آپ نے علماء، سجادہ نشین، پنڈتوں

اور پجاریوں کی سرپرستی کی۔ میر عثمان علی خاں نے مندروں کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ مندروں میں روزانہ ہونے والی اور خاص موقعوں پر پوجاؤں کے لئے عطیے دیئے۔ جن مندروں کو سالانہ معاش مقرر تھی ان میں قابل ذکر مندر گولی پورہ، اونکار مندر، مندر بالاجی مادنا پیٹ، مندر شنکر باغ اور مندر گول ناتھ تھے۔ بھدرا چلم اور تروپتی کے مشہور بالاجی مندر کے لئے سالانہ معاش مقرر تھی۔ سیتارام باغ کی نگہداشت کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی تھی[9]۔ اس مندر کے پجاری کی وفات کے بعد پسماندگان کی پرورش کے لئے وظیفہ جاری کیا[10]۔ اس کے علاوہ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں کے حکم کے مطابق ۸/مارچ ۱۹۱۵ء میں سوامی پرتھوانی بانیکر مٹ کانچی کو پانچ سو روپیہ رخصتانہ اور خلعت میں دوشالہ دینے کی منظوری دی گئی[11]۔ ان کے علاوہ اننت گیری بالاجی مندر، ناندیڑ، رینوکا دیوی مندر ضلع عادل آباد، بیکنٹھ مندر ناندیڑ، دیول مایارام وغیرہ کی نگہداشت کے لئے بھی معاش جاری کی گئی۔

۱۹۳۵ء میں ریاست اندور کی نمائندگی پر گرشنیشور مندر کی نگہداشت کے لئے بذریعہ فرمان حکم صادر کیا گیا[12]۔ اسی طرح کاکتیہ دور سے تعلق رکھنے والے آثار یعنی ہنمکنڈہ کے ہزار ستون کی مرمت کے لئے اعلیٰ حضرت نے فرمان نکال کر ضروری بندوبست کی ہدایت کی[13]۔ میر عثمان علی خاں کے دورِ حکومت میں ہندو مندروں کے لئے ستیانوے ہزار روپیہ کی مدد معاش اور دو لاکھ ایکڑ سے زیادہ کی جاگیریں عطا فرمائی گئیں۔ حکومت نظام کے جانب سے مندروں کو دی جانے والی گرانٹس اور جاگیروں سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نوجوان ریسرچ اسکالرس کے لئے آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز میں اس موضوع پر ریسرچ کرنے کے لئے بہت زیادہ آرکیول رکارڈز موجود ہیں۔

ہندو منادر کی طرح دوسرے غیر ہندو ادارے بھی نظام کی اسلام رواداری سے برابر بہرہ مند ہوتے رہے۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں میں غیر مذہبوں اور غیر قوموں کے درمیان ایک حد فاصل قائم رکھی جاتی ہے اور انہیں اعلیٰ خدمات سے بھی دور رکھا جاتا ہے۔ لیکن آصف جاہی حکومت اور فرمانروا اس حکمت عملی سے دور رہے۔ ان کے یہاں حاکم اور محکوم میں کوئی حد فاصل نہیں تھی۔ شاہانِ آصفیہ نہ صرف پابند مذہب تھے بلکہ روادار بھی تھے۔ میر عثمان علی خاں نے بھی اپنی خاندانی روایات کو برقرار رکھا۔ حیدرآباد کی فضاء کبھی ہندو مسلم فسادات سے مکدر نہیں رہی بلکہ رعایا کی باہمی یک جہتی کو یہاں بڑھاوا اور استحکام ملا۔ اس کی ایک مثال پیش ہے۔

ویکاجی کے ریسٹوراں کے سامنے نواب افسر جنگ کمانڈر اعظم افواج حیدرآباد نے ایک مسجد کی تعمیر شروع کی تھی جس کے قریب ایک چھوٹا سا دیول واقع تھا۔ جب میر عثمان علی خاں کے علم میں اس تعمیر کی بات لائی گئی تو آپ نے روداری کا ثبوت دیتے ہوئے فوراً احکام جاری کئے اور مسجد کی تعمیر بند کرنے کا حکم صادر فرمایا[۱۴]۔

مملکتِ نظام میں مسلمان ملازمین کو فریضہ حج ادا کرنے اور مقدس مقامات جیسے مکہ، مدینہ، کربلا، نجف، بغداد، بیت المقدس کی زیارت کے لئے چھ ماہ کی رخصت خاص معہ تنخواہ پیشگی حاصل کرنے کی سہولت حاصل تھی۔ یہی سہولت عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی تھی لیکن ہندو ملازمین کو ایسی کوئی سہولت نہیں تھی۔ یہ معاملہ اس وقت بابِ حکومت میں زیر بحث رہا جب رام سروپ ٹنڈن نامی ایک سرکاری ملازم نے مقدس مقامات کی جاترا کے لئے چھ ماہ کی رخصت خاص اور پیشگی تنخواہ کے لئے عرضی دی۔ اس معاملہ کی اطلاع ہونے پر آصف سابع نے کونسل کی رائے مانگی اور ان کی

رائے سے اتفاق کرتے ہوئے آپ نے ضابطہ ملازمت میں فوراً ترمیم کرنے کا فرمان جاری کیا۔ چنانچہ ۲۹ر جولائی ۱۹۳۴ء میں ہندوؤں کو بھی یہی سہولت فراہم کرنے کے لئے حسب الحکم اعلیٰ حضرت فرمان مبارک اجراء ہوا۔ آصف جاہ سابع نے ناصرف ایک بے مثال ترمیم کی بلکہ ہندو ملازمین کو بھی یہ سہولت فراہم کر کے اپنی مذہبی رواداری کی عمدہ مثال قائم کی[۱۵]۔

ملک میں مساوات کی فضاء کو بحال رکھنے کی غرض سے مہاراجہ کشن پرشاد کے دورِ مدارالمہامی میں نظامت امور مذہبی کی جانب سے ایک گشتی کے ذریعہ مسجدوں کے اطراف گراما فون اور ریڈیو بجانے کی ممانعت کی گئی۔ ساتھ ہی مساجد سے قریب واقع مکانات، چائے خانے اور مذہبی عبادت گاہوں میں ڈھول، نقارہ اور باجوں کا استعمال بوقت نماز ممنوع قرار دیا گیا[۱۶]۔ اس کے علاوہ عام جلسوں میں اشتعال انگیز اور قابل اعتراض تقریروں، لکچروں، مذہبی وعظ، خطبوں اور مباحثوں میں دوسرے فرقے یا دوسرے مذاہب پر قابلِ اعتراض بیان بازی پر بھی پابندی عائد کی گئی تا کہ تعصب کی آگ بھڑکنے نہ پائے۔ اور فسادات برپا نہ ہوں[۱۷]۔

ہندو رعایا کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے میر عثمان علی خاں آصف سابع نے اپنی ڈیوڑھی مبارک میں گاؤکشی موقوف کی۔ ۱۹۲۰ء میں بذریعہ فرمان گائے کی قربانی کو بھی ممنوع قرار دیا[۱۸]۔ اسی طرح ماہ محرم میں سوانگ بھرنا یا دوسری رنگ رلیاں منانے پر پابندی عائد کی کیونکہ شیعوں کے لئے یہ مہینہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

آصف جاہ سابع کی دریا باری اور سرفرازی بہ لحاظ مذہب و ملک و امارت عام تھی۔ آپ نے یونیورسٹی کے قابل اشخاص اور ضعیف عہدہ دارانِ دیوانی کو ان کے تجربہ کی بنا پر خود اپنے یہاں یا پائیگاہوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا تھا تا کہ ملک کی

رعایا اور ملازمین قدیم مرفع الحال رہیں اور بے روزگاری بڑھنے نہ پائے۔ غریب اہل ملک کو ان کی موروثی خدمات پر فائز کر کے ہمیشہ امیر و غریب ہر دو طبقوں کی خوش حالی اور باہمی اتحاد و عمل کے لئے کوشاں رہے[19]۔

آصف سابع نے قدیم روایت کو قائم رکھتے ہوئے سکھوں کے ساتھ بھی روادارانہ سلوک رکھا۔ سکھوں کے بچوں کی تعلیم کے لئے خاص انتظام تھا۔ ان کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ اگر کوئی سکھ لاولد مر جاتا تو پنجاب میں ان کے اعزا و اقربا میں سے اس کا جائز وارث یا قریب ترین رشتہ دار تلاش کیا جاتا تھا اور متوفی سکھ کی جگہ اس کو مقرر کیا جاتا تھا۔ اگر وہ وارث یا رشتہ دار نابالغ ہوتا تو ایسی صورت میں سنِ بلوغت تک متوفی کی نصف تنخواہ بطور وظیفہ اُسے ملتی تھی۔ بالغ ہونے پر متوفی کی جگہ پر مقرر کیا جاتا تھا۔ حکومت نظام میں بڑی تعداد میں سکھوں کو پولیس اور باڈی گارڈ کے طور پر ملازمت دی گئی تھی[20]۔

حیدرآباد باوجود ایک مسلمان ریاست ہونے کے وہاں نوجوانوں کی بڑی تعداد عیسائیت کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے ریاست میں تعلیم پھیل رہی تھی عیسائیت ترقی پذیر تھی۔ عیسائیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اس بات کا ثبوت تھی کہ اعلیٰ حضرت تنگ دل نہیں تھے ان کی ریاست میں رعایا کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔

ہندوستان میں قدیم زمانے ہی سے دیوداسیوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ عموماً ہندو لڑکیاں ہوتی تھیں جنہیں مندروں کی نذر کیا جاتا تھا۔ یہ لڑکیاں عمر بھر کنواری رہتی تھیں اور جبراً مندروں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ عثمان علی خاں کے دورِ حکومت میں یہ رسم قانوناً موقوف کی گئی۔ اس طرح ان لڑکیوں کو مندروں کی گرفت سے آزاد کرایا گیا[21]۔ ان اشخاص کو جو لڑکیوں کو جبراً دیوداسی بننے پر مجبور

کرتے تھے انہیں دو سے دس سال کی قید اور جرمانہ عائد کرنے کی سزاء تجویز کی گئی۔

اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں آصف سادس کی رعایا پروری اور قدر شناسی نے ملک کے لوگوں کا دل جیتا تھا۔ لیکن آصف سابع نے اپنی محبت، فضیلت، سادگی اور برتر و اعلیٰ اخلاق سے لوگوں کے دلوں پر اپنا سکہ جمایا تھا۔ آپ کے دورِ مملکت میں کئی محکمہ جات جیسے محکمہ تعمیرات، آرائش بلدہ، افواج، مال، وغیرہ وغیرہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ان سب میں محکمہ مال کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ اس محکمہ کی خدمات سے متعدد اشخاص خاص کر امراء روساء وغیرہ بہت فیض یاب ہوئے۔ کیونکہ اس محکمہ کی وجہ سے قرضہ لینے اور واپس کرنے کی سہولتیں مہیا تھیں۔ قدیم ساھوکاروں سے قرضہ حاصل کرنے اور ان کی ادائیگی میں لوگوں کو کئی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور وہ قرض کے جال میں الجھ کر رہ جاتے تھے۔ میر عثمان علی خاں کی نظرِ عنایت سے کیا ہندو کیا مسلمان سبھی کو بہ آسانی سرکاری قرضہ ملنے لگا۔ جاگیرداروں اور منصب داروں نے اسی سرکاری سہولت کی بناء پر قرضہ جات سے نجات پائی تھی۔ اعلیٰ حضرت کی نظر عنایت اور الطافِ کرم کی وجہ سے کئی سمستانوں اور متعدد جاگیرداروں کے گھر قائم و برقرار رہے۔ سمستان گدوال کے ساتھ مراعات فرمائی گئیں۔ سمستان ونپرتی کے جھگڑے کو مٹا کر انہیں اطمینان اور چین بخشا گیا۔ راجہ راؤ رنبھا، راجہ رگھوتم راؤ، راجہ گنیش راؤ مرحوم کے خاندان آپ کے مراحم خسروانہ کے رہین منت تھے۔

ریاست حیدرآباد میں چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان انکم ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔ باوجود اس کے کہ یہاں ساہوکار، تاجر پیشہ اور جاگیرداروں کی بڑی تعداد تھی۔ جس کا فائدہ زیادہ تر ہندوؤں کو پہنچتا تھا کیونکہ بڑی تعداد میں ہندو کاشتکاری، تجارت اور اعلیٰ عہدوں سے جڑے تھے۔

حکومت نظام میں خدمات جلیلہ کی سرفرازی میں ہندو اور مسلمانوں میں امتیاز نہیں برتا گیا۔ قدیم امراء کی عزت افزائی فرما کر حضور اقدس نے روایاتِ آصفیہ کو جو زینت بخشی اس کی نظیر تاریخ دکن پیش نہیں کر سکتی۔ مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت و پیشکار جیسے قابل، نیک نام، ہر دل عزیز ہستی کو عہدہ وزارت اعظمیٰ سے سرفراز فرما کر آپ نے قدر شناسی، ذرہ نوازی اور رواداری کا اعلیٰ نمونہ قائم کیا۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً فرامین اجراء کر کے ذاتِ شاہانہ نے نواب خان خاناں، نواب فخر الملک، نواب شہاب جنگ کے قدیم گھرانوں کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ ان کے جانشینوں کی سرفرازی سے ہمت افزائی کی آپ ہی کے دورِ معدلت میں راجہ فتح نواز ونت کو صدر المہام مال اور صرفِ خاص مقرر کیا گیا راجہ دھرم کرن، راجہ اندر کرن کو اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا گیا اور راجہ شام ونت بہادر کو عہدہ صدر المہامی سے سرفراز فرمایا۔ ان کے علاوہ وینکٹ راما ریڈی کوتوال بلدہ، تارہ پوروالا مشیرِ مال، راجہ نرسنگھ راج مہتمم سیونگ بنک نظامت پٹہ تھے۔ آصف جاہ سابع مذہبی تعصب سے بلند تھے اور ساری رعایا کو یکساں شفقت مرحمت فرماتے تھے۔ ملک کی قابلِ قدر ہستیوں کا اعلیٰ عہدوں پر انتخاب کا فیصلہ ایک مدبر اور روادار ہستی ہی انجام دے سکتی ہے[۲۳]۔

میر عثمان علی خاں روادار ہونے کے ساتھ ایک دردمند دل کے مالک تھے۔ انہیں انسان ہی نہیں حیوانوں کی تکلیف بھی گوارا نہیں تھی۔ کنگ کوٹھی کے ملازمین سے آپ کا سلوک بہت مشفقانہ تھا۔ محل مبارک کے کسی نوکر کے بیمار ہونے پر اس کے لئے فکر مند رہتے تھے۔ اس کی دوا، پرہیز کی فکر کرتے اور علاج میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے دیتے تھے۔ آپ کو کسی ملازم کا بھوکا رہنا پسند نہ تھا۔ جانوروں کے زخمی ہونے کی صورت میں بھی آپ ویسے ہی فکر مند رہتے تھے[۲۴]۔ رعایا کی خوشی، ان کی شادی

بیاہ کی تقاریب اور مذہبی تقاریب میں کھلے دل سے شریک ہوتے ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے۔ میت کے ساتھ چند قدم چلتے تھے۔ انسانی ہمدردی آصف جاہ کی شخصیت کا نمایاں وصف تھا[۲۵]۔

ایک دفعہ کسی کی مزاج پرسی کے لئے دواخانہ عثمانیہ تشریف لے جاتے ہوئے آپ نے ایک ایسے غریب آدمی کو دیکھا جو اپنے دونوں پیر کھو چکا تھا۔ وہ اپنے پیروں پر چمڑا باندھ کر زمین پر گھستے ہوئے جا رہا تھا۔ اس غریب آدمی کی حالت دیکھ کر آپ اتنے متاثر ہوئے کہ راستے ہی سے کنگ کوٹھی واپس ہو گئے۔ اپنے مشیروں سے مشورہ کے بعد پنجہ گٹہ میں اراضی خرید کر ۳۰ لاکھ روپیوں کی لاگت سے نظامس آرتھو پیڈک ہاسپٹل قائم کیا[۲۶]۔ جہاں مصنوعی اعضاء بنانے اور غریبوں کا مفت علاج کرنے کی سہولتیں دی گئیں۔ میر عثمان علی خاں نے ایک اچھے کارِ ثواب کے لئے پیشہ خرچ کیا لیکن آپ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ آپ نے تاحیات اپنی رعایا اور ملک کی خدمت کے جذبہ سے جو ہاسپٹل قائم کیا تھا وہ اب ایک محض تجارتی ہاسپٹل ہو کر رہ گیا۔

رائچور کے سفر کے دوران ایک پولیس کانسٹبل کی ٹرین سے زخمی ہونے کے بعد موت ہو گئی۔ اس صدمے کو حضور پرنور برداشت نہیں کر سکے۔ آپ نے اس کی بیوہ کو کانسٹبل کی پوری تنخواہ کا وظیفہ بحال فرمانے کا حکم دیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے یہاں ادنیٰ اور اعلیٰ خدمت گاروں کی قدر و منزلت تھی۔ جان نثاروں کو جاں نثاری کا صلہ فراخ دلی سے ملتا تھا۔

حیدرآباد میں غیر ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ پس ماندہ قوموں کی حالت درست کرنے کے لئے دولت آصفیہ نے کئی تدابیر اختیار کیں کیونکہ اس قوم میں تعلیم

کا فقدان تھا ان میں ملازمتوں کی تقسیم کا سوال پیدا ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ لہذا ان کی تعلیمی حالت سدھارنے کی کوشش کی گئی۔

ہندو مہاسبھا جو ایک سوشیل آرگنائزیشن تھا پسماندہ اقوام کی فلاح و بہبود کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں پسماندہ قوموں نے اپنے سیاسی اور انسانی حقوق پر غور کرنے کے لئے دس ہزار نمائندوں کا ایک بڑا جلسہ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں منعقد کیا تھا۔ اس جلسہ میں ڈاکٹر امبیڈکر کو لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں نمائندگی کے لئے انتخاب کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس جلسہ میں کئی ریزولوشن پیش ہوئے ان میں سے ایک ریزولوشن میر عثمان علی خاں حکومت نظام کے نام بھی شکریہ کے طور پر روانہ کیا گیا جس میں یہ درج تھا۔

اس جلسہ میں پسماندہ قومیں حضور نظام کی بے حد ممنون و مشکور ہیں ۔ جو پسماندوں کی تعلیمی پستی کو دور کرنے کے لئے پوری کوشش اور دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے۔ حضور نظام نے پسماندہ قوموں کی تعلیم کے لئے خاص طور پر اسکولس قائم کئے ہیں۔ جس کی مثال ہندوستان بھر میں نہیں ملتی۔ جلسہ میں دیگر والیانِ راست سے بھی یہ درخواست کی گئی کہ وہ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نظام ہفتم کے اس مدبرانہ عمل کی تقلید کریں،،[۲۷]

میر عثمان علی خاں نے پسماندہ اقوام کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا آپ نے رواداری کی مثال قائم کرتے ہوئے کہا کہ۔

''میری نظر میں نہ کوئی قوم بلند ہے اور نہ کوئی اچھوت ہے میں سب کو بہ حیثیت بنی نوع ایک طرح سے برابر سمجھتا ہوں''[۲۸]

انجمن امداد باہمی کا قیام عمل میں لایا گیا تا کہ زراعت پیشہ، دستکار اور صنعت

کاروں کی مدد کی جائے اور ان کو قرضہ جات اور دیگر سہولتیں مہیا کی جائیں۔ اُسی طرح قبائیلیوں کی فلاح و بہبود، تعلیم اور ان کی مالی اور معاشی حالت سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

میر عثمان علی خاں ہندو مسلم بھائی چارہ کے علم بردار تھے۔ غیر مسلموں کو آپ نے یقین دلایا کہ جہاں تک ان کے معاملات کا تعلق ہے ان کے ساتھ وہی روادارانہ سلوک ہوگا جو وہ مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ آپ فرماتے تھے کہ ''جس طرح ان کے دل میں مذہبی پیشواؤں کی عزت وقدر ہے اسی طرح دوسرے مذاہب کے مذہبی مقتدا ان کی نظروں میں عزت کے مستحق ہیں کیونکہ حکومت نظام مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں اور ان کے مذہبی رہنماؤں اور رسومات کا برابر احترام کرتی ہے بہ حیثیت فرمانروا وہ ''صلح کل'' کی پالیسی پر عقیدہ رکھتے ہیں کیونکہ ان کے زیر سایہ مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں اور ہر مذہب کے معائبد کی نگہداشت ان کی آئین سلطنت کا ایک زمانے سے وطیرہ رہا ہے''۔ نا صرف آپ کے آبا و اجداد بلکہ خود بدولت کا شعار رہا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کو ایک نظر سے دیکھا جائے اس مشرب پر آپ کے بزرگوں کو ہی نہیں آپ کو بھی ناز تھا۔ اپنی بے مثل رواداری سے آصف سابع نے ہر قوم وفرقہ کی مدد کی تاکہ کوئی آپ کی نوازشوں اور عنایات سے محروم نہ ہونے پائے۔

میر عثمان علی خاں نظام ہفتم کے دورِ حکومت میں ریاست حیدرآباد نے زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی لیکن تعلیم سے آپ کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سے آپ نے اس جانب زیادہ توجہ فرمائی۔ آپ کے دور حکومت میں متعدد اسکول اور کالجس کھولے گئے۔ پرائمری تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دے کر معیار تعلیم کو بڑھایا گیا۔ آپ

کے دورِ حکومت کا سب سے بڑا کارنامہ عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہے کیونکہ حیدرآباد میں اعلیٰ تعلیم کے لئے طلباء کو دوسری یونیورسٹیوں کا رُخ کرنا پڑتا تھا۔ میر محبوب علی خاں آصف سادس کے دورِ حکومت میں مسٹر بلنٹ کی تحریک پر یونیورسٹی کے قیام کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا لیکن تعلیمی معیار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یونی ورسٹی کے قیام کا فیصلہ ترک کیا گیا [۲۹]۔

عثمانیہ یونیورسٹی ہندوستان کی وہ واحد یونیورسٹی تھی جس میں ذریعہ تعلیم اُردو زبان تھی۔ اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے رابندر ناتھ ٹیگور نے عثمانیہ یونیورسٹی کی تعریف میں لکھا کہ۔

> "میں عرصہ سے اس انتظار میں تھا کہ ہندوستان میں ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جو بیرونی زبانوں کی بندشوں سے آزاد ہو اور ہمارا ذریعہ تعلیم صحیح معنوں میں عام آدمی تک پہنچے۔ عثمانیہ یونیورسٹی صحیح معنوں میں ایک ودیا پیٹھ ہے اور سارے ہندوستان کی سودیشی یونی ورسٹی ہے [۳۰]۔

آصف جاہ سابع کی تعلیمی دلچسپی صرف اپنی ریاست تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ آپ نے بیرون ریاست کئی اسکول، کالج، یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں کو فراخ دلانہ امداد دے کر اپنی رواداری اور وسیع النظری کا ثبوت دیا۔ جن میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، شانتی نکیتن، بنارس ہندو یونی ورسٹی، اسلامیہ کالج پشاور، آندھرا یونی ورسٹی، جامع ملیہ، بھنڈارکر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونا اور سری۔ وی۔ رامن کی انڈین اکیڈیمی آف سائنس بنگلور قابل ذکر ہیں۔

حیدرآباد سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت

زیادہ تھی لہذا اس یونیورسٹی کی توسیع اور دیگر کاموں کے لئے خاطر خواہ امداد دی گئی۔
شانتی نکیتن کو ۱۹۲۷ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کی درخواست پر دو لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا گیا جہاں اس فیاضانہ عطیہ سے فارسی زبان کی کرسی قائم کی گئی۔ بنارس ہندو یونیورسٹی اور انجمنِ حمایت اسلام کو حضور پرنور نے ۳۰ ہزار روپیہ کی منظوری صادر فرمائی۔ آپ دونوں اداروں میں امتیاز برت کر بلاوجہ لوگوں کو اعتراض کا موقع دینا نہیں چاہتے تھے حالانکہ بابِ حکومت نے بنارس ہندو یونیورسٹی [۳۱] کو ۳۰ ہزار روپیہ اور انجمن حمایت اسلام کو ۲۵ ہزار روپیہ دینے کی سفارش کی تھی۔ اسلامیہ کالج پشاور [۳۲] کو ایک لاکھ روپیہ کلدار کے علاوہ ساڑھے تین فیصدی والے پچاس ہزار روپیہ مالیت کے پرامیسری نوٹ بھی دیئے گئے تھے۔ اس عطیہ کے ساتھ یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ اس امداد کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی، بھائی چارہ اور یگانگت پر خرچ کیا جائے۔

مرہٹواڑہ میں کئی اسکول شیواجی کے نام سے منسوب کئے گئے تھے۔ جیسے شیواجی ملٹری اسکول کولھاپور، ہائی اسکول کھام گاؤں اور شیواجی ہائی اسکول امراوتی کو بھی امداد دی گئی۔ اول الذکر کو ۵ ہزار اور موخر الذکر دونوں اسکولوں کو بیس ۲۰ ہزار فی کس دینے کا حکم صادر فرمایا [۳۳]۔

بھنڈارکر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونا کو نہ صرف گیسٹ ہاوز کی تعمیر کے لئے دس ہزار روپیہ کا عطیہ دیا گیا بلکہ ہندوؤں کی مقدس کتاب مہابھارت کی اشاعت کے لئے بھی گراں قدر عطیہ دیا گیا۔ سر سی۔ وی۔ رامن نے بھی اپنی انڈین اکیڈیمی آف سائنس بنگلور کے لئے عطیہ دینے کی درخواست کی تھی۔ آپ نے ایک فرمان کے ذریعہ کونسل کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے دو ہزار روپیہ کلدار سالانہ چندہ کا حکم دیا [۳۴]۔

۱۰ اس سے قطع نظر کئی ہندو اور مسلمان عالموں، دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کی قدردانی وسرپرستی کی۔ انہیں وظائف جاری کئے جن میں شبلی نعمانی، عبدالحلیم شرر، سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ کئی اسے نامور ادیب بھی آپ کی ریاست سے جڑے تھے جنہیں کتابوں کی اشاعت کے لئے مالی امداد دی گئی۔

آپ کی جود وسخا حیدرآباد کی سرحدوں کو پار کر کے دور دراز کے مقامات تک پہنچ گئی تھی۔ لوگوں کی تکالیف آپ سے سنی نہیں جاتی تھیں۔ آپ نے اناٹولیہ اور بہار کے زلزلے سے متاثرہ مصیبت زدہ گان کی مدد فرمائی۔ بنگال کے قحط زدہ علاقوں کو مدد بھجوائی۔ لندن میں جرمن بمباری سے متاثرہ افراد کی مدد کی [۳۵]۔ آپ کو جب کبھی کوئی ناگہانی آفت کی اطلاع ملی آپ نے فراخ دلانہ امداد دی۔

آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کو فنِ تعمیر سے بڑی دلچسپی تھی۔ ٹاون ہال، عدن باغ، ہائی کورٹ، عثمانیہ ہاسپٹل، کتب خانہ آصفیہ، جامعہ عثمانیہ، جوبلی ہال، سٹی کالج، مسجد باغ عام اور جودی مسجد میں رواداری کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان عمارتوں کی تعمیر کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں ہندو مسلم اور مغربی طرز تعمیر کا امتزاج ہے۔

کئی غیر مسلم رہنماؤں اور مشہور شخصیتوں نے حیدرآباد کی امتیازی خصوصیات، رواداری، عدل گستری اور تعلیم میں برتری کا اعتراف کیا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد اور رواداری کے متعلق مشہور ومعروف اخبار نویس اور ممتاز رہنما پنڈت راج نارائن دہلوی نے لکھا ہے۔

"جب میں حیدرآباد کی طرف روانہ ہوا تو اخبارات کی اطلاعات

کے مطابق میرا خیال تھا کہ حیدرآباد میں مندروں کی طرف حکومت
نظام کوئی توجہ نہیں دیتی اور ان کی حالت قابلِ اعتراض ہے میں نے
سوچا وہاں پہنچ کر ضرور حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کروں گا۔
لیکن یہاں آنے پر بعد تحقیقات مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ
تمام خبریں گمراہ کن اور غلط بیانی پر مبنی تھیں۔ یہاں کے تمام مندروں
کو حکومت سرکاری عالی کی طرف سے مالی امداد مل رہی ہے جن کی
تعداد مسلم معابد کی نسبت بہت زیادہ ہے"[۳۶]۔

آصف جاہی دورِ حکومت کی امتیازی خصوصیت اس کی روایتی رواداری اور وسیع النظری تھی جس کا مظاہرہ ان کی رعایا وغربا پروری، مساوات اور ہم آہنگی کی حکمت عملی میں صاف جھلکتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں ایک فرمان جاری کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نے فرمایا تھا۔

"میں یہ نہیں چاہتا کہ کسی مذہب یا قوم کے جذبات کو اپنی تنگ نظری
سے ٹھیس پہنچاؤں یا اپنے مذہب میں اتنا غرق ہوجاؤں کے میں
متعصب سمجھا جاؤں۔ میری اور میرے آبا و اجداد کی ہمیشہ یہ حکمت
عملی رہی ہے کہ نا صرف دنیا کے تمام مذاہب کو بغیر کسی فرق اور
امتیاز کے ایک سمجھوں بلکہ تمام مذاہب کے ساتھ ہم آہنگی اور
مساوات کے ساتھ پیش آؤں۔ ویسے ہی جیسے دودھ میں شکر۔"

آخر میں متذکرہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ میر عثمان علی خاں آصف سابع ایک نیک دل، ہمدرد، فیاض، غربا پرور، فرلیس، مدبر اور روادار انسان تھے۔ آپ کی ریاست حیدرآباد کی اپنی ایک بے مثال تہذیب تھی ایک کلچر تھا اور اس

کا اپنا نظامِ مملکت۔ آپ کی سلطنت میں ہندو بھی تھے، سکھ، عیسائی، پارسی اور مسلمان بھی تھے اور یہ سب شیر وشکر کی طرح رہتے تھے۔ نہ کبھی ہندو مسلم فساد ہوا نہ کبھی خون کی ندیاں بہیں نہ کبھی یہاں تعصب کو بڑھاوا دیا گیا۔ تمام رعایا آصف سابع کی رواداری کا دم بھرتی تھی۔ خود آصف سابع مساوات اور یکجہتی میں یقین رکھتے تھے اور سب کے ساتھ آپ کا یکساں سلوک تھا۔ ۱۹۳۵ء تک حیدرآباد ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔

بتدریج حیدرآباد کی سیاست میں ہلچل ہونے لگی۔ تحریک آزادی کی سرگرمیاں سارے ہندوستان کی طرح یہاں بھی بڑھ گئیں۔ کانگریس، ہندو مہاسبھا، انجمنِ اتحاد المسلمین جو رضاکاروں کی تنظیم تھی، ابھرنے لگیں۔ جمہوریت کے حامی حیدرآباد کو انڈین یونین میں ضم کرنا چاہتے تھے۔ مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد کو مملکت اسلامیہ میں تبدیل کرنے کی کوشش میں تھی۔ خود ریاست حیدرآباد کے حاکم آزاد رہنے پر اصرار کر رہے تھے۔ بساطِ سلطنت پر بتدریج فرقہ پرست عناصر کا تسلط بڑھنے لگا۔ انہوں نے ملک میں تشددانہ سرگرمیاں بڑھا دیں جس کی وجہ سے ہندو مسلم فسادات ہونے لگے۔ ملک کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑ دینے کے بعد صورتِ حال اور بدل گئی۔ جس کے لئے خود اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں تیار نہ تھے۔ ریاست میں ہونے والے واقعات سے براہ راست ان کا تعلق نہ رہا۔ یہی حیدرآباد کی بہت بڑی ٹریجڈی تھی۔ جو میر عثمان علی خاں کو بہت مہنگی پڑی۔ آپ ہی کے اطراف جمع بے ایمان، غدار اور غلط رائے دینے والے لوگوں نے جنہیں خود بدولت نے روزی روٹی دی، دربار میں عزت بخشی، ان پر بھروسہ و اعتماد کیا انہوں نے ہی آصف سابع کو دغا دی۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۸ء تک پیش آنے والے واقعات سے آپ سبھی واقف ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک

ایسی حقیقت ہے جس کی گواہ ماضی کی تاریخ کے وہ اوراق ہیں جن میں میر عثمان علی خاں آصف سابع کی رواداری گم ہوکر رہ گئی۔ راجہ نرسنگھ راج عالیؔ کے مطابق اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ

دکن کو ہے شہ عثمان پہ فخر اے عالیؔ
ہمیں یہ فخر ہے ان کا کوئی جواب نہیں

حوالہ جات

۱۔ شمیم علیم Development in Administration under H.E.H the Nizam - VII عثمانیہ یونیورسٹی پریس۔۱۹۸۴ء ص ۲۸۔۲۹

۲۔ مولوی سید وقار احمد۔ ادوار خاندانِ آصفی ۔ ماہ نامہ، سفینۂ نسواں ۔ سالگرہ نمبر۔ حیدر آباد۔ نومبر ۱۹۲۲ء۔ ص ۔۱۳

۳۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز۔ انسٹالمنٹ ۴۷۔ لسٹ نمبر ۱۰۔ فرمان مبارک بتاریخ ۱۵ر جنوری ۱۹۲۲ء

۴۔ راجہ نرسنگ راج عالیؔ ۔ روئیداد جلسہ تہنیت جشن جوبلی مبارک ۔ حیدر آباد۔ ۱۱ر فروری ۱۳۴۶ف ۔ مطابق ۱۹۳۶ء

۵۔ رامن راج سکسینہ ۔ تذکرہ دربار حیدر آباد ۔ ترقی اردو بیورو ۔ نئی دہلی ۔ ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۰۸

۶۔ مملکتِ آصفیہ۔ محبانِ دکن ۔ کراچی ۔ ۱۹۷۸ء ص ۲۰۷۔ ۲۰۸۔

۷۔ حیدر آباد کے قصے، کہانیاں اور روایات، مطبوعہ روز نامہ سیاست ۔ حیدر آباد ۱۹۹۴ء۔ ص ۳۴۔

۸۔ مانک راؤ وٹھل راؤ۔ بستانِ آصفیہ۔ جلد سوم ۔ مطبع انوار السلام ۔ حیدر آباد۔ ۱۹۲۰ء۔ ص ۱۳۔

۹۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز۔ صیغہ امور مذہبی۔ فرمان مبارک میر عثمان علی خاں ۔ انتظام دیول سیتارام باغ۔ ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء

۱۰۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز۔ صیغہ امور مذہبی۔ فرمان مبارک ۔ ۱۹۳۹ء

۱۱۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز۔ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ ۔ حکم میر عثمان علی خاں

آصف سابع ۔۲۱ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ مطابق ۸؍مارچ ۱۹۱۵ء۔

۱۲۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز ۔ پولٹیکل ڈپارٹمنٹ ۔ ایچ ۔ ای ۔ ایچ دی نظامس گورنمنٹ ۔ اسٹالمنٹ نمبر۲ ۔لسٹ نمبر۳ ۔ سریل نمبر ۲۲۶ ۔

۱۳۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز ۔ پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ ۔ انسٹالمنٹ نمبر ۳۴ لسٹ نمبر ۳ ۔ سریل نمبر ۸۶۳ ۔

۱۴۔ رئیس احمد جعفری ۔ حیدرآباد جو کبھی تھا ۔ حسامی بک ڈپو ۔ حیدرآباد ۔ ۱۹۹۶ء ص ۴۵۴ ۔

۱۵۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز ۔ فرمان مبارک آصف سابع ۔ ۲۹؍جولائی ۱۹۳۴ء انسٹالمنٹ نمبر ۸۴ ۔ لسٹ نمبر ا ۔ سریل نمبر ۱۱۹ ۔

۱۶۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز ۔ محکمہ امور مذہبی ۔ گشتی نمبر ۶۴ ۔ بتاریخ ۱۳؍ تیر ۱۳۴۵ف مطابق ۱۸؍مئی ۱۹۳۶ء ۔

۱۷۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز ۔ فرمان مبارک اعلیٰ حضرت ۔ ۱۳۴۰ھ مطابق ۷؍فروری ۱۹۲۳ء ۔

۱۸۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز آنربل سر اکبر حیدری ۔ Report on Modern Hyderabad ۔ ص ۱۳ ۔

۱۹۔ شاہان دولت آصفیہ کی سرفرازیاں ۔ صدرالمہام کی خدمت میں ایک کھلی اور مخلصانہ یادداشت ۔ ۱۳۴۸ف مطابق ۱۹۳۸ء ص ۲ ۔ ۳ ۔

۲۰۔ میجر جنرل سید ال احمد ادروس Hyderabad of the seven Loafs ۱۹۹۴ء ۔ ص ۔ ۱۱۳ ۔

۲۱۔ رئیس احمد جعفری ۔ بحوالہ بالا ۔ ص ۔ ۴۵۵ ۔

۲۲۔ رئیس احمد جعفری ۔ بحوالہ بالا ۔

۲۳۔ راجہ نرسنگھ راج عالیؔ۔ بحوالہ بالا۔ ص۔۵۔۶۔

۲۴۔ مملکتِ آصفیہ۔ بحوالہ بالا۔ ص۔۲۰۷۔

۲۵۔ طیبہ بیگم۔ آصف سابع میر عثمان علی خاں اور ان کا عہد۔ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد۔۱۹۹۳ء۔ ص۔۱۰۲۔

۲۶۔ حیدرآباد کے قصے کہانیاں اور روایات بحوالہ بالا۔ ص۔۲۴۔

۲۷۔ مملکت آصفیہ۔ بحوالہ بالا۔ ص۔۱۸۹۔

۲۸۔ طیبہ بیگم۔ بحوالہ بالا۔ ص۔۱۰۳۔

۲۹۔ کے۔ کرشنا سوامی مدیراج۔ Pictorial Hyderabad Vol II۔ چندر کانت پریس۔ حیدرآباد۔۱۹۳۴۔ ص۔۵۳۳۔

۳۰۔ ڈاکٹر شیلا راج۔ The Legacy of the Nizam's۔ وانی پرکاشن۔ نئی دہلی۔۲۰۰۲۔ ص۔۶۸۔

۳۱۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز۔ انسٹالمنٹ نمبر ۸۴۔ لسٹ نمبر ۵۔ سریل نمبر ۴۳۴۔

۳۲۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز۔ صیغہ فینانس۔ فرمان مبارک آصف سابع۔ ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء۔

۳۳۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز۔ انسٹالمنٹ نمبر ۸۵۔ لسٹ نمبر ۲۔ سریل نمبر ۴

۳۴۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکیوز۔ صیغہ سیاست۔ فرمان اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں۔ بتاریخ ۲/جون ۱۹۳۶ء۔

۳۵۔ India's Premier Ruling ۔Theo . La. Touche Princes۔ ٹھاکر اینڈ کمپنی۔ بمبئی۔۱۹۴۶ء۔ ص۔۴۳۔

۳۶۔ مملکتِ آصفیہ۔ بحوالہ بالا۔ ص۔۵۲۵۔

شاہان آصفیہ اور ہندو مسلم روایات

آصف جاہی دور کی دوسو سالہ تاریخ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ ان دو صدیوں میں اہل دکن چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ان کی زندگی کا مرکز ومحور آصف جاہی فرمانروا کی ذات ہی رہی ۔ ہر فرمانروا نے اپنے اپنے دورِ حکومت میں کسی نہ کسی وجہ سے انتہائی مقبولیت حاصل کی ۔عموماً دیکھا جاتا ہے کہ حکمرانِ وقت زندگی کے مختلف شعبوں میں جو معیار قائم کردیتے تھے رعایا بھی اپنے آقا ومالک کی تقلید کو بخوشی حاضر رہتی ۔سبھی اس بات سے واقف ہیں کہ آصف جاہی فرمانرواؤں نے اپنے آپ کو اہل حیدرآباد کی زندگی کے نشیب وفراز ، ان کے رنج اورغم اور ان کی خواہشات ، ان کی تمناؤں اور آرزوؤں سے جوڑ رکھا تھا۔ رعایا کے سکھ دکھ میں برابر کے شریک رہتے اور ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ۔اسی رعایا پروری نے بلا تفریق ہر مذہب وملت کے لوگوں کو ان کا دلدادہ اور گرویدہ بنادیا تھا۔ رعایا نے شاہانِ آصفی کو اپنی زندگی اور خوشیوں کی پناہ گاہ مان کر زندگی کے آڑے وقتوں میں انہیں کے زیر سایہ پناہ لی اور راحت وتسکین پائی۔

آصف جاہ اول کا شمار ، مذہبی ، اخلاقی اور سیاسی وفوجی اعتبار سے ہندوستان کے بڑے فرمانراواؤں میں کیا جاتا ہے۔ دکن کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد آپ نے جس تہذیب کی بنیاد رکھی وہ دہلی کی تھی ۔کیونکہ خاندانی اثرات کے علاوہ بچپن ہی سے مغلیہ کلچر اور خاص طور پر شہنشاہ عالمگیر کے سایہ میں پروان چڑھنے سے آپ کی

سیرت پر عمدہ اثرات کا گہرا اثر تھا۔ دہلی کلچر نہ ہی خالص اسلامی کلچر تھی اور نہ ہی خالص مغل اس پر راجپوت اثرات زیادہ نمایاں تھے۔ چنانچہ آصف جاہ نے دانشمندانہ قدم اٹھاتے ہوئے مرہٹوں کے ساتھ تعلقات بڑھانا اور ان کو ساتھ لینا ضروری سمجھا۔ آپ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ہندو مسلمانوں کا میل جول خود دکنی کلچر کی روایات کا ایک جزو بنا ہوا ہے۔ چنانچہ ملکی معاملات میں آپ نے ہندوؤں کو شامل کرنا شروع کیا۔ دکنی روایات پر عمل کرتے ہوئے لالہ منسارام کو اپنا پیشکار اور معتمد اعلیٰ مقرر کیا۔

اس طرح آصف جاہ اول کے دورِ حکومت سے ہی یہ روایت بن گئی کہ مدارالمہام ریاست شیعہ مسلمان اور پیشکار ہندو ہوا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کے دور حکومت تک جاری رہا۔

آصف جاہ اول کے دربار میں جو قاعدے اور قانون جاری تھے ان کو ''ضوابطِ حضور پرنور'' میں لالہ منسارام نے تفصیل سے پیش کئے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ ''نظام الملک نے نظم و ضبط کو منظّم کرنے کے لئے قواعد مرتب کئے تھے اور چاہتے تھے کہ امرا اور درباری دربار میں شرکت کے دوران ان پر پابندی سے عمل کریں۔ آصف جاہ اول کے ہمراہ کئی ہندو اور مسلمان شمالی ہندوستان سے دکن آئے تھے اور انہوں نے آصف جاہ اول کے ہمراہ کئی لڑائیاں بھی لڑی تھیں وہ اپنے آپ کو نظام کے برابر سمجھتے تھے۔ ان کو وہ تمام مراعات حاصل تھیں جو نظام الملک کو بحیثیت فرمانروا حاصل تھیں۔ ان مراعات میں سجے ہوئے ہاتھی، مورچھل وغیرہ شامل تھے۔ جب شکر کھیڑا کی جنگ میں فتح حاصل کر کے آصف جاہ حیدرآباد کی طرف بڑھے تو آپ نے دیکھا کہ آپ کے رشتہ دار اور ممتاز امراء تمام مراعات کے ساتھ ہاتھی پر

سوار ہیں۔اس پُرشکوہ جلوس میں نظام اور امراء کے ہاتھی میں امتیاز کرنا دشوار تھا۔لہذا امراؤں پر چند پابندیاں عائد کی گئیں۔چنانچہ مغل دربار میں مروج آداب کو لاگو کیا گیا۔صرف زمینداروں کو اجازت تھی کہ سو سے زائد سوار، پالکی اور نقارہ استعمال کریں۔ہاتھی کا استعمال صرف شادی بیاہ کے موقعوں تک ہی محدود تھا![1]

دربار میں شرکت کرنے والے کو ''میردہ'' کے پاس اپنا نام درج کرانا پڑتا تھا۔ نام لکھوانے کا یہ طریقہ ''اسم نویسی'' کہلاتا تھا ۔

دربار منعقد کرنے کی روایت نہایت قدیم اور صدیوں سے جاری ہے۔آصف جاہی حکمرانوں نے اس روایت کو مغل حکمرانوں سے لیا۔ابتدأ دربار صرف سیاسی اغراض کے لئے منعقد ہوا کرتے تھے۔آصف جاہی حکمرانوں نے اس روایت میں تبدیلی لاتے ہوئے مختلف موقعوں کے علاوہ حکمرانِ وقت کی سالگرہ کے موقعہ پر بھی دربار منعقد کرنا شروع کیا۔آصف جاہی فرمانروا چونکہ روادار تھے لہذا ہندو اور مسلمان تہواروں جیسے دسہرہ، بسنت، ہولی، بقرعید اور نوروز پر دربار منعقد کرتے تھے۔یہ دربار عموماً مغلئی دربار کہلاتے تھے۔درباروں میں روایتی لباس دستار، جامہ، نیمہ، بگلوس اور تلوار لازماً تھا۔ان درباروں میں فرمانروا کو نذر دینے کا رواج تھا۔

ان درباروں میں اعزازات، خطابات اور دوسرے انعامات مختلف درباریوں، امرائے عظام اور معزز روساء کو دیئے جاتے تھے۔ان کی تقسیم میں مذہب اور ملت کا کوئی امتیاز نہیں تھا بلکہ افراد کی وفاداری اور ان کی کارگزاری کو پیشِ نظر رکھ کر یہ اعزازات تقسیم کئے جاتے تھے انگریزی دربار کے اختتام پر خود حکمرانِ وقت رزیڈنٹ کو عطر اور پان پیش کرتے تھے۔آصفیہ دربار کی روایت کے بموجب مدارالمہام یا پیشکار امراء کو ان کے مرتبہ اور حیثیت کے لحاظ سے عطر اور پان پیش

کرتے تھے۔ بعدازاں مسند کے تکیئے ادل بدل کئے جاتے تھے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتے تھے کہ دربار کا اختتام ہوتا ہے[۲]۔

دربار عموماً رات میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان درباروں کی شان وشوکت اور تزک بھڑک قابلِ دید ہوتی تھی۔ خاص طور پر میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے درباروں کی شان وشوکت، روشنی سے جگمگاتا دربار ہال، کرسٹل شینڈ لیرز، سازندوں کی مدبھری دھنیں عجیب پر لطف نظارہ پیش کرتی تھیں۔ میر عثمان علی خاں چونکہ نہایت سادگی پسند تھے۔ آصف جاہ اول کے نقش قدم چلتے ہوئے دربار نہایت سادگی سے منعقد کرتے تھے انہیں کی روایت کو اپناتے ہوئے آپ نے دربار میں تزک بھڑک منسوخ کردی تھی۔

تغیراتِ زمانہ، ماحول اور آپسی میل جول نے یہاں کی فضاء ہی بدل دی۔ بتدریج یہاں کی تہذیب میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں اور یہاں کی تہذیب میں انفرادیت نظر آنے لگی۔ آصف جاہ اول نے جس تہذیب کی بنا ڈالی تھی اس میں لوگوں کو متحد کرنے، بھائی چارگی اور اتحاد ورواداری کو بڑھاوا دینے پر زور دیا گیا تھا اس کو نہ صرف بعد کے فرمانرواؤں نے بڑھاوا دیا بلکہ امراء، روساء، اور خود عام شہریوں نے بھی اس کو پروان چڑھانے میں مدد کی۔ اس ریاست کی عمارت امن و آشتی کی بنیاد پر کھڑی تھی۔ مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی جیسے مضبوط ستون نے اس کو سہارا دیا تھا۔ جہاں ہندو اور مسلمان ایک جان دو قالب تھے۔ ان کے باہمی اتحاد و اعتماد، میل جول، بھائی چارگی، مذہبی رواداری، پیار ومحبت اور ایثار و اخلاص نے انہیں انتہائی قریب کردیا کہ ہندو اور مسلمان کی تہذیب، زبان، رہن سہن، عادات واطوار، طرز تعمیر، رسوم ورواج اور آداب اور اخلاق میں یکسانیت

آ گئی تھی حیدرآباد میں بھائی چارگی اور یکسانیت کی یہ ایسی نظیر ہے جو ہندوستان کے کسی اور حصہ میں نہیں پائی جاتی۔

پچھلی دوصدی کی تاریخ میں آصف جاہی فرمانرواؤں کا مقام بہت بلند رہا۔ سیاسی انتشار، افراتفری، لوٹ مار، دنگے فساد، اقتدار کی رساکشی، انگریزوں کی بے جا مداخلت کے درمیان جو سب سے بڑا کارہائے نمایاں انجام دیا گیا وہ ان کی رعایا پروری تھی۔ ان کا رعایا کے لئے پیار و اخلاص ایسا تھا کہ سب قوموں کو ایک مضبوط رشتہ میں باندھ رکھا تھا۔ اسی مضبوط رشتہ کی دین یا اس دور کا اہم ورثہ جو موجودہ نسل کو ملا ہے وہ ان سے جڑی ہوئی خصوصی روایات ہیں جو انہیں نمایاں اور ممتاز کرتی ہیں۔ یہ روایات سبق آموز ہیں اور ناقابل فراموش بھی۔ حیدرآباد کے خواص و عوام میں کیا غیر معمولی یکسانیت تھی اور کیا روایات تھیں یہ جاننے کے لئے سب سے پہلے ہم ان کے لباس پر نظر ڈالتے ہیں۔

دکن کے لوگ بھولے بھالے تھے۔ ان کی معاشرت سیدھی سادی تھی دیہاتوں میں عموماً لوگوں کا لباس دھوتی، صدری یا کوٹ، سرخ یا سفید پگڑی تھی۔ سرخ پگڑی مرہٹواڑہ کے ان علاقوں میں پہنی جاتی تھی جو اس وقت حیدرآباد میں شامل تھے علاقہ تلنگانہ میں سفید پگڑی کا رواج تھا۔ علاوہ اس کے کمبل ناگزیر تھا۔ ہندو عورتیں ساڑی چولی اور مسلمان عورتیں لہنگا، چولی اور دوپٹہ کا استعمال کرتی تھیں[۳]۔

آصف جاہی حیدرآباد میں جہاں تک لباس کا تعلق ہے ابتداء میں قطب شاہی اثرات نمایاں رہے۔ آصف جاہ اول نے درباریوں کے لئے خاص لباس تجویز کیا ان میں نیمہ، جامہ اور سبز رنگ کی دستار تھی۔ سرخ یا سبز دستار پہن کر دربار میں آنا منع تھا۔ اسی طرح شال یا مفلر سے سر کو ڈھنکنے کی ممانعت تھی۔ ہندو امراء کا لباس علیحدہ ہوا

کرتا تھا۔ انہیں شال، سفید لانبی کوٹ، صدری اور دستار کی اجازت تھی، نوک دار جوتے استعمال کر سکتے تھے۔ مسلمان امراء پا تابوں کا استعمال کرتے تھے اور ہندو امراء چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے[۴]۔

نظام الملک آصف جاہ اول کپڑوں کے اقسام، ان کا رنگ، ان کے ڈیزائن اور خاص طور پر اس کی قیمت پر توجہ دیتے تھے۔ آپ کو مسولی پٹنم کے پرنٹڈ کپڑے زیادہ پسند تھے۔ آپ سادہ لیکن خوش وضع کپڑوں کو ترجیح دیتے تھے۔ امراء سلطنت اور اپنے فرزندوں کے کپڑوں میں کوئی فرق پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ کے فرزند ناصر جنگ نے آپ کے خلاف بغاوت کی تھی جس میں انہیں شکست ہوئی اور نظر بند ہونا پڑا تھا۔ آپ کی نظر بندی کے دوران محل کی بیگمات کے اصرار پر آپ کی پسند کے لئے چند ملتانی کپڑے بھجوائے گئے تھے ناصر جنگ کو وہ کپڑے پسند نہیں آئے انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ کپڑے اصطبل کے گھوڑوں کے کام آسکتے ہیں ان کے قابل نہیں۔ یہ بات جب آصف جاہ کے علم میں لائی گئی تو آپ نے پہلے وہ رجسٹر منگوایا جس میں ان کپڑوں کی قیمت درج تھی جو اس وقت آپ زیب تن کئے ہوئے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ اس رجسٹر میں کپڑے کی اوسطاً قیمت سات روپیہ تھی جبکہ ناصر جنگ کو بھیجے جانے والے کپڑے کی اوسطاً قیمت نو روپیہ تھی۔ اعلیٰ حضرت نے قیمتوں کی دونوں فہرستیں ناصر جنگ کو بھیج دیں۔ اور ناصر جنگ کی سزاء کی میعاد بڑھا دی[۵]۔

اس واقعہ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ آصف جاہ کی نظر میں سب برابر تھے۔ امیر، غریب اور شہزادے میں کوئی فرق نہ تھا۔

آصف جاہی درباری لباس میں دستار کی بہت اہمیت تھی۔ جو کھڑکی دار، پیٹھا،

ہمہ اقسام کی دستاریں

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس ہمراہ مہاراجہ کپورتھلہ

۱۸۹۶ء

شاہ نواز خوانی، منصبداری کہلاتی تھیں۔ مختلف خاندانوں میں استعمال کی جانے والی دستاریں اس خاندان کی پہچان تھیں۔ ان دستاروں سے مذہب اور پیشہ کی شناخت میں بھی مدد ملتی تھی۔ دوسرے کی دستار پہننے والے کو نامہذب تصور کیا جاتا تھا۔ پدرانہ شفقت سے محروم لوگ سفید دستار پہنتے تھے جبکہ دوسرے رنگین دستار استعمال کرتے تھے۔ دستاروں کے رنگ الگ ہوا کرتے تھے۔ آصف جاہی دستار کا رنگ زرد تھا اس میں جڑاوی طرہ لگا ہوتا تھا[۶]۔ امراء جاگیردار اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان گلابی، لال، سفید اور قرمزی رنگ کی مخصوص خاندانی دستار پہنتے تھے۔ شہر کے عمائدین خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ترکی یا رومی ٹوپی زیب سر کرتے تھے یا پھر سرکاری دستار پہنتے تھے[۷]۔ بعد ازاں شملہ، پگڑی اور مختلف ٹوپیوں کا رواج ہوا۔

آصف جاہی دورِ حکومت میں انگرکھے کا بھی عام رواج تھا۔ انگرکھے سوتی، آغابانی اور کنچی کے ہوا کرتے تھے۔ اعیانِ سلطنت کے انگرکھے گھیردار اور ٹخنے تک لمبے ہوتے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں پہنا کرتے تھے۔ لیکن ان کی شناخت انگرکھے کے ڈیزائن کے فرق سے کی جاتی تھی۔ مسلمانوں کے انگرکھے میں بٹن بائیں جانب اور ہندوؤں کے انگرکھے میں سیدھے جانب ہوا کرتے تھے۔ بڑھائی، سنار، لوہار اور نچلے طبقے کے لوگوں کے انگرکھے کھادی کے ہوتے تھے لیکن لمبائی صرف کمر تک محدود تھی۔ خاص صورتوں جیسے عید، تہوار، شادی بیاہ کے موقع پر لمبے انگرکھے پہننے کا رواج تھا[۸]۔

انگرکھے کی ایک اور قسم ڈگلا تھی جو استر دار روئی سے تیار کی جاتی تھی۔ اس کا استعمال صرف موسمِ سرما میں ہوا کرتا تھا۔ ہندو اور مسلمان امراء اور اعلیٰ طبقہ میں عموماً مروج تھا۔ اوائل عمر میں سر سالار جنگ استعمال کرتے تھے لیکن راجہ گردھاری پرشاد

ہمیشہ ڈگلا زیب تن کیا کرتے تھے۔آپ کے اس مخصوص لباس کو دیکھ کر ایک رزیڈنٹ نے مذاقاً آپ سے دریافت کیا تھا کہ وہ انگریز عورتوں کا لباس کیوں پہنتے ہیں۔جس کا جواب بھی راجہ صاحب نے برجستہ دیا کہ یہ لباس صرف عورتوں سے مخصوص نہیں بلکہ آپ کے مرشد اور رہنمائے دین پادری صاحبوں کا بھی ڈریس ہے جس کی ہر وقت تعظیم ہونی چاہیے[۹]۔

لباس کے بارے میں حیدرآباد کا مذاق بہت پاکیزہ تھا۔عموماً لوگ خوش پوشاک تھے اور لباس کی تراش،خراش میں جدتیں کرتے تھے۔انیسویں صدی کے اختتام سے قبل امور سلطنت میں کئی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔روایتی درباری لباس میں بھی تبدیلی لائی گئی۔نیمہ اور جامے کی جگہ شیروانی،دستار اور بگلوس درباری لباس قرار دیا گیا۔شیروانی عموماً رنگین جیسے زرد،گلابی،سبز رنگ کی ہوتی تھیں اور انواع اقسام کے کپڑوں جیسے سلک،ساٹن،ہمرو،جامہ وار اور ٹویڈ سے تیار کی جاتی تھیں۔شادی کے موقع پر رنگین شیروانی کا استعمال ہوتا تھا۔دلہا کے لئے کمخواب کی شیروانی ہوتی تھی۔شیروانی میں عام طور پر چھ یا سات بٹن ہوتے تھے۔پورے بٹن لگانا کالر کو بند رکھنا تہذیب اور شائستگی کی نشانی تھی کیونکہ کالر کھلا رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا[۱۰]۔لباس کا بھی مذہب ہوتا ہے۔لیکن شیروانی کا یہاں کوئی مذہب نہیں تھا۔بلالحاظ مذہب وملت پہنی جاتی ہے اسی وجہ سے حیدرآبادی شیروانی اتنی مقبول ہوئی کہ سارے ملک پر چھا گئی۔

ہندو مسلمانوں میں ہمہ اقسام کے پاجامے جیسے تمبان،فیل پایہ،گرگی،دہرا پاجامہ،ڈھیلا پاجامہ اور چوڑی دار پاجامہ پہننے کا رواج تھا۔تمبان کا استعمال جامہ کے ساتھ ہوتا جو ڈھیلا ہوا کرتا تھا۔تمبان مشروع اور کمخواب کے ہوا کرتے تھے۔فیل

مکمل زیورات سے آراستہ ہندو رانی

۱۹۰۸ء

پایۂ کھادی سے تیار کئے جاتے تھے۔ حیدرآباد میں دوہرے پاجامے کی ایجاد نواب اقبال الدولہ وقار الملک نے کی تھی[۱۱]۔

آصفی دور کی عورتیں مغلیہ لباس جیسے ڈھیلا یا تنگ پاجامہ اور کرتنی استعمال کرتی تھیں۔ اعلیٰ اور متوسط طبقہ جامہ، پیشواز، دوپٹہ، پاجامہ، کرتا یا لہنگا، کرتنی اور دوپٹہ استعمال کرتا تھا۔ ہندوؤں میں ساڑی بلاوز، لہنگے اور دوپٹے کا رواج مروج تھا۔ بتدریج پیشواز کا استعمال کم اور پاجامہ ودوپٹہ کا استعمال زیادہ ہونے لگا۔ شادی شدہ ہندو ومسلمان عورتوں کا لباس عموماً ساڑی بلاوز تھا[۱۲]۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر دونوں قومیں کناری کے کپڑے پہنتی تھیں۔ دلہنوں کا لباس خاص طور پر کناری کا ہوتا تھا۔ سہاگن عورتیں رنگین کپڑوں میں ملبوس رہتیں کیونکہ سفید کپڑے پہننا معیوب سمجھا جاتا تھا جو عموماً بیوہ عورتیں پہنتی تھیں۔

غرض شہر حیدرآباد میں فرمانروائے سلطنت، شاہی خاندان کے افراد، امراء و شرفا اور اہل منصب اور عام لوگوں کے لباس میں یکسانیت تھی بجز کپڑے کی قیمت اور اس کے اقسام۔

حیدرآباد میں خوشنما، خوبصورت اور قیمتی زیورات کے استعمال کا رواج صرف خواتین تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ مرصع، طلائی یا نقری زیورات کا استعمال ہندو اور مسلمان مردوں میں مروج تھا جو صرف قطب شاہی فرمانرواؤں کے دور حکومت میں ہی نہیں تھا بلکہ آصف جاہی حکمراں بھی زیورات کا استعمال کرتے تھے۔ زیورات کا استعمال اعزاز اور وقار کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ سربراہ مملکت، امرائے عظام، جاگیردار، منصب دار، معززین اور عام آدمی بہ وقت دربار، شادی بیاہ، عید و تہوار اور خاص موقع پر زیور پہنتے تھے دربار کے موقعوں پر آصف جاہی فرمانروا درباریوں کو

حسب معمول زیور عطا فرماتے تھے جن میں قابلِ ذکر سر پیچ، سر پٹی، جیغہ، طرہ، کلغی، آصفی طرہ، کنٹھی، ہار، مالا، بازو بند، بھج بند، نورتن، دست بند اور سمرن تھے۔ جو درباریوں کی حیثیت اور مرتبہ کے مطابق سرفراز ہوتے تھے۔ جواہرت کے ساتھ کبھی خطاب اور کبھی خلعت سے بھی نوازا جاتا تھا۔ سرفرازیٔ زیورات میں کبھی ہندو مسلمان کی تخصیص نہیں تھی[۱۳]۔

خواتین کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں زیور کی دلدادہ ہوتی ہیں۔ ہندو اور مسلمان عورتیں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں میں زیور زندگی کا لازمی حصہ بن گئے ہیں۔ سر، چوٹی، ماتھے، ناک کان، گلے، بازو، کلائی، پنجہ، کمر، پاؤں اور پاؤں کی انگلیوں کے زیورات کے نام ظاہر کرتے ہیں کہ ان میں زیادہ تر نام ہندی زبان کے ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ بعض زیورات کے استعمال کا طریقہ ہندوؤں سے سیکھا گیا ہے۔ ان تمام زیورات کا استعمال یکساں طور پر ہندو اور مسلمان عورتیں کرتی ہیں۔ غریب سے غریب افراد بھی اپنی لڑکی کو شادی کے موقع پر بغیر زیور کے وداع نہیں کرتے تھے۔ گلے کا لچھا تو ضرور دیا جاتا تھا۔ دولت مندوں کی بات ہی اور تھی لیکن متوسط طبقہ بھی اس بات کی کوشش ضرور کرتا تھا کہ اپنی لڑکی کو کم سے کم کان، گلے، ہاتھ اور پاؤں کا ایک ایک زیور ضرور دیں بغیر زیور کے لڑکی کو وداع کرنے میں والدین اپنی بے عزتی محسوس کرتے تھے[۱۴]۔

مسلمانوں میں ڈاڑھی رکھنے کا رواج تھا جبکہ ہندو ڈاڑھی منڈواتے اور مونچھ رکھتے تھے۔ سابق میں ہندو دوران شرادھ اور ماتم کے دنوں میں حجامت نہیں بنواتے تھے۔

ہندو اور مسلمان خواتین میں چوٹی کا رواج عام تھا۔ لیکن ہندو عورتیں جوڑا باندھتی اور پھولوں سے سنوارتی تھیں۔ بال دھونا، سکھانا، ان میں تیل لگانا، چوٹی

گوندھنا، چوٹی کے آخری سرے میں ہمہ اقسام کی موباف سے پھول بنانا بھی عام تھا۔ ہندو اور مسلمانوں میں کانچ کی چوڑی، منگل سوتر یا لچھا سہاگ کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ ہاتھ میں صرف سونے کی چوڑی پہننا معیوب سمجھا جاتا تھا[۱۵]۔ نئی چوڑیاں پہنتے وقت چوڑی والی کو پان، سپاری اور نیگ دیا جاتا تھا۔ سونی کلائیوں کو خراب تصور کیا جاتا تھا۔

عصر حاضر میں ہی نہیں زمانہ قدیم سے حیدرآباد کی تہذیب میں دسترخوان کی اہمیت بہت زیادہ تھی جو خالص ہندوستانی ہوتا تھا۔ آج کی طرح چھری، کانٹے، چمچے اور نیپکن دسترخوان کی زینت نہیں ہوا کرتے تھے۔ مہمان نوازی حیدرآبادیوں کے لئے طرہ امتیاز تھی اور یہاں کی تہذیب کی عظمت کا نشان تھی۔ میزبانی اور مہمان نوازی میں حیدرآبادیوں کا جواب نہیں تھا۔ پکوان بنانا ایک آرٹ ہے۔ حیدرآباد میں ماہر باورچیوں کی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی فنکارانہ مہارت کا ایسا سکّہ جمایا تھا کہ آج بھی لوگ ان لوازمات کے ذائقہ کو یاد کر کے محظوظ ہوتے ہیں۔ صاف ستھرے دسترخوان، ان پر چنے انواع اقسام کے لوازمات' روٹی، چٹنیاں، میٹھے ان کو رونق بخشنے والی ہستیاں نہ صرف لذیذ اور خوش ذائقہ کھانوں سے لطف اندوز ہوتیں بلکہ میزبان کے ذوقِ سلیم کی داد بھی دیتی تھیں۔

حیدرآبادی کھانے پینے کے بہت شوقین اور ان کا ذوقِ طعام بہت اعلیٰ تھا۔ آصف جاہی فرمانرواؤں میں افضل الدولہ نظام پنجم کھانے کے بیحد شوقین تھے اور ماشاءاللہ آپ کی خوراک بھی اچھی تھی۔ سرکاری روزنامچہ کے مطابق ناسازئ مزاج کی وجہ سے خاص معالجہ آپ کے علاج کے لے طلب کئے گئے جنہوں نے کیفیت سن کر دوا تجویز کی اور آپ سے پرہیز بھی کرنے کی درخواست کی۔ آصف جاہ

خامس نے حکیم صاحب سے پاؤ لڈو کھانے کی اجازت چاہی۔ حکیم صاحب نے لڈو تناول فرمانے سے منع نہیں کیا۔ دو چار دن بعد جب پھر حضور پرنور اسی بیماری میں مبتلا ہوئے تو حکیم صاحب کو دوبارہ طلب کیا گیا۔ حکیم صاحب معمولی حکیم نہیں تھے انہیں اپنی دواؤں پر کامل بھروسہ تھا وہ اعلیٰ حضرت کی بیماری سے بہت ہی حیران و پریشان ہوئے۔ اثنائے گفتگو آپ نے اعلیٰ حضرت سے عرض کیا کہ انہوں نے غذا میں کیا تناول فرمایا تھا۔ سادگی سے حضور پرنور نے فرمایا بس میں نے وہی پاؤ لڈو ہی کھایا تھا۔ جس کی آپ نے اجازت دی تھی۔ حکیم صاحب حیران تھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معمولی لڈو بھی بیماری کا سبب بن سکتا ہے۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت سے لڈو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اعلیٰ حضرت کے حکم پر چاندی کی کشتی میں زرین تورہ پوش سے ڈھک کر لڈو حکیم صاحب کے آگے رکھا گیا۔ لڈو دیکھ کر حکیم صاحب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان کی آگے کشتی میں مغزیات اور اصلی گھی سے تیار کیا گیا چھ سیر کا لڈو رکھا تھا۔ انہیں بادشاہ سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کیونکہ یہ آداب شاہی کے خلاف تھا۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ پائے کہ آپ نے بجا ارشاد فرمایا حضور نے صرف پاؤ لڈو (جو ڈیڑھ سیر کا تھا) ہی تناول فرمایا تھا۔ حکیم صاحب کی بات پر آصف جاہ خامس بہت خوش ہوئے اور لڈو مع کشتی حکیم صاحب کے گھر پہنچانے کا حکم دیا[16]۔

اہل شہر بازار کے کھانے سے زیادہ گھر کے کھانے کو ترجیح دیتے تھے۔ عمدہ قسم کے پکوان کے لیے گھر پر مامائیں ہوتی تھیں۔ امراء اور رؤسا کے یہاں ماہر باورچی ہوتے۔ بلا تخصیص امیر و غریب چاول، ترشی اور زیادہ مرچ کھانے کے عادی پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں۔

لباس کی طرح ہندو اور مسلمانوں کے کھانوں میں بھی یکسانیت تھی۔ بریانی،

پلاؤ دیگر لوازمات، اچار، چٹنی، ہمہ اقسام کی روٹیاں اور میٹھوں کو دستر خوان پر چنا دیکھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ میز بان ہندو ہے یا مسلمان، پائیگاہی امراء، دوسرے مسلمان جاگیردار کے دستر خوان میں اور مہاراجہ کشن پرشاد، راجہ شیوراج یا کوئی اور ہندو گھرانے میں کوئی فرق نہ تھا[۱۷]۔ بالخصوص کایستھوں اور مسلمانوں کے کھانوں میں اتنی زیادہ یکسانیت تھی کہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل تھا۔

آصف جاہی دور کی یہ روایت تھی کہ فرمانروائے وقت کے لیے خانساماں ہندو ہوا کرتے تھے۔ میر محبوب علی خاں کے دورِ حکومت میں ایک دفعہ کمسن شہزادے میر عثمان علی خاں کی تعلیم کے لیے مقرر کردہ ایک استاد نے اعلیٰ حضرت سے عرض کیا کہ خانساماں کی خدمت کے لیے مسلمانوں کے بجائے ہندوؤں کا انتخاب کیوں کیا جاتا ہے۔ ان دنوں راجہ گردھاری پرشاد خانساماں کی خدمت پر فائز تھے۔ بادشاہ سلامت کی نظر میں ہندو اور مسلمان دونوں یکساں تھے۔ آپ کو یہ بات بہت ناگوار لگی۔ لہٰذا آپ نے استاد سے کہا کہ میرے دربار میں متعصب لوگوں کی جگہ نہیں۔

شکم پور، ہندوستانی قورمہ، شب دیگ، دو پیازہ، سلطانی دال، ٹِٹی کباب، سیخ کباب، طوطک، سموسے، جہازی قورمہ، میتھی مرغ، دالچہ، حلیم، پسندے، نہاری اور بریانی حیدرآباد کے قدیم اور مشہور ترین پکوان ہیں۔ اسی طرح ڈبل کا میٹھا، خوبانی کا میٹھا، قلاقند، گل فردوس، پورن پوری وغیرہ آج بھی مقبول عام ہیں۔ ناشتہ میں دہی، انڈا، تلا ہوا گوشت، قیمہ پراٹھے، روغنی روٹی اور کھچڑی عموماً کھائی جاتی تھی۔ اس لیے کہا جاتا تھا کہ:

کھچڑی کے ہیں چار یار

قیمہ پاپڑ گھی اچار

اہل حیدرآباد چاول، املی، امباڑہ وغیرہ کے ترش وشدید مرچوں والے سالن کے علاوہ باجرہ یا جوار کی روٹی، دال اور ترکاری کھاتے تھے۔ عام آدمیوں اور خاص کر نچلے طبقہ میں چاکنہ مقبول عام تھا۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ ذی مرتبت جمعدار نواب مسلم جنگ کی خواہش پر اعلیٰ حضرت نے آپ کی دعوت قبول فرمائی اور وقت مقررہ پر آپ دعوت میں پہنچ گئے۔ مسلم جنگ نے اپنی دیرینہ آرزو کی تکمیل میں کئی لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ گھر کو بہت قیمتی قالینوں اور ساز وسامان سے آراستہ کیا تھا۔ سازندوں اور گانے والوں کا بھی اہتمام کیا تھا۔ دسترخوان پر انواع اقسام کے ان گنت لذیذ کھانے بڑی خوش سلیقگی سے رکھے گئے تھے۔ حضور پرنوران سارے انتظامات کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے آپ نے مسلم جنگ سے دریافت کیا کہ ''میرے کھانے کے لیے کونسی ڈش ہے''۔ مسلم جنگ نے مودبانہ عرض کیا 'حضور جس کسی بھی ڈش کی فرمائش کریں' مسلم جنگ کی بات سن کر حضور پرنو نے فرمایا 'مجھے چاکنہ چاہیے' مسلم جنگ کا دسترخوان انواع اقسام کی ڈشوں سے سجا تھا کمی تھی تو فقط چاکنے کی۔ مسلم جنگ کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ ساری محفل پر سکتہ کا سا عالم تھا۔ چاکنہ غریبوں کی ڈش ہے دولت مند اور امیر کے دسترخوان کی زینت کیسے بن سکتی تھی۔ مسلم جنگ جن کا چہرہ حضور پرنور کی آمد پر فخر سے دمک رہا تھا منہ لٹکائے شرمندگی سے کھڑے رہے۔ حضور نے سکوت توڑا فرمایا 'چاکنہ نہیں ہے تو کیا ہوا جو کچھ ہے حاضر کیا جائے'۔ حضور پرنور نے یہ بات بڑی سادگی سے کہی تھی لیکن آپ کی سادہ لوحی نے مسلم جنگ کو یہ سبق دیا کہ آدمی کو کبھی مغرور نہیں ہونا چاہیے [۱۸]۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ آصف جاہی دور میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ شادی بیاہ کی رسومات جیسے منگنی، گھوڑا جوڑا، رتجگہ، مہندی،

چوتھی، شب گشت و باز گشت سبھی ملتے جلتے ہیں اگر چیکہ یہ تمام رسومات ہندو ہیں لیکن دونوں قوموں کے آپسی میل جول اور بھائی چارگی کے باعث جب ایک تہذیب دوسرے پر اثر انداز ہوئی تو مسلمانوں نے ان رسومات کو اپنالیا[19]۔ یہ تمام رسومات امراء، روسا اور شرفا کے گھرانوں میں ہی مروج نہیں تھیں بلکہ متوسط اور غریب طبقہ بھی ان کا پابند تھا۔ شان وشوکت اور پیسے کی فراوانی امیری اور غریبی کو بانٹتی ضرور ہے لیکن غریب ہندو اور مسلمان اپنی خوشی کا اظہار اپنی حیثیت اور حدوں میں ہی کیا کرتے تھے۔

تورہ بھیجنا، پھول کے ہار اور پاندان پیش کرنے کا رواج حیدرآباد کے امراء اور جاگیردار و منصب دار گھرانوں میں رائج تھا۔ تورہ کی تقسیم صرف مسلمان، اعلیٰ طبقہ ہی کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کی تقسیم میں امیر و غریب کی تفریق نہیں تھی۔ صاحب خانہ کی حیثیت کے مطابق دو سے اکیس ڈش کا تورہ تقسیم ہوتا تھا۔ خوش قسمتی سے تورہ کسی غریب کے گھر پہنچ جاتا تو اس گھر میں عید ہو جاتی تھی۔

آصف جاہی دور کے مسلمانوں میں شادی بیاہ کی طرح بچے کی پیدائش پر ہونے والے رواجوں جیسے چوماسہ، ستوانسہ، نوماسہ اور بچے کی پیدائش، چھٹی، مونڈن، نام رکھائی، کھیر چٹائی، سالگرہ، بسم اللہ خوانی، ناک اور کان چھیدائی وغیرہ سب رسومات جو ہندوؤں کے تھے آج بھی مروج ہیں۔

آصف جاہی دور میں یہ بھی روایت ہے کہ خوشی کی مواقع جیسے شادی بیاہ، بچے کی پیدائش، سالگرہ وغیرہ پر نوبت، روشن چوکی، طاشہ مرفہ، بینڈ، قوالی اور مراثینوں کے گانوں سے محفلیں سجتی تھیں۔ اس کا رواج ہندو اور مسلمان دونوں میں تھا۔ نوبت بجانے والے عموماً مسلمان ہوتے اور روشن چوکی بجانے والے ہندو ہوتے تھے[20]۔ ہندو

گھرانوں میں شادی کے موقع پر نوبت بجانے سے قبل اس کی پوجا کرتے ہیں۔ قوال اپنی قوالی سے مردانے میں محفلوں کو محظوظ کرتے تھے تو مراثنیں زنانے میں گاتی تھیں۔

شاہی محل میں بچے کی پیدائش پر بہت خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ وہ گھر کہ وقار میں اضافے کا باعث ہوتا تھا۔ اسی لئے رشتہ داروں اور شاہی محل میں مٹھائی تقسیم کی جاتی تھی۔ آصف جاہی روایت کے مطابق بچہ کی پیدائش کا اعلان توپ داغ کر کیا جاتا تھا۔ امرائے عظام اور دوسرے معززین بھی اسی روایت پر عمل پیرا تھے۔

وفات کے بعد ہونے والی رسومات زیارت، دسواں، تیرہویں، چہلم اور برسی سبھی ہندو رواج ہیں لیکن ہندوؤں کی طرح مسلمان بھی ان کے پابند ہیں۔ حالانکہ ان رسومات کا تعلق مذہب اسلام سے نہیں ہے[۲۱]۔ مغلیہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے آصف جاہی فرمانروا بھی امرائے عظام، معززین شرفا، جاگیرداروں اور منصب داروں کو خاندان میں میت ہونے پر بعد پُرسہ سفید شال مرحمت فرماتے تھے[۲۲]۔

قدیم حیدرآباد میں شادی بیاہ، پیدائش اور وفات کے علاوہ یہاں کے ہندو اور مسلمانوں میں کئی ایسے رواج رائج تھے جن پر وہ پابندی سے عمل کرتے تھے۔ دونوں قوموں میں عیادت اور تعزیت کا رواج مختلف انداز میں ہوتا تھا۔ دستور کے مطابق صاحبِ خانہ کو اخلاقاً بیمار کی عیادت کو آنے والے کو کرایہ دینا ہوتا تھا۔ وفات کے بعد یکشنبہ اور چہارشنبہ کو تعزیت کے لئے نہیں جاتے تھے۔ تجہیز و تکفین میں بغیر کسی فرق اور عمر کا لحاظ کئے لوگ آمادہ ہو جاتے تھے۔ بعض ہندو اور مسلمان گھرانوں سے جس مکان میں رحلت ہوئی ہو اس خاندان کے دیگر افراد کے لئے کھانا بھیجا جاتا تھا یہ روایت آج بھی جاری ہے[۲۳]۔

آصف جاہی دور کی ایک روایت تھی کہ جب کبھی میت کا جلوس سڑک سے گذر

رہا ہوتا ہندو اور مسلمان ضرور کاندھا دیتے تھے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ میت کس کی ہے اور اس کا تعلق کس مذہب اور طبقہ سے ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم تھے[۲۴]۔

بادشاہ کی شخصیت، طرز عمل، اخلاق اور ان کے رویہ کا اثر ہر خاص و عام ہوتا ہے۔ چنانچہ آصف جاہی حکمرانوں نے ان پر خاص توجہ دی اور اپنے طرز عمل اور اخلاق سے عام لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی۔ شاہی دربار کے آداب اور نشست و برخاست اور شاہی طور طریقوں میں اسلامی اخلاقی اور ہندو سماجی آداب کے اثرات مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں۔ جنہوں نے درباریوں پر اپنے دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ آصف جاہ اول کے دربار سادگی، کفایت اور آداب و اخلاق کی ترجمانی کرتے تھے۔ نظام علی خاں نے ہندو اور مسلمانوں میں میل جول پر زور دیا۔ سکندر جاہ نے نا صرف ہندوؤں کو بڑی خدمات پر مامور کیا بلکہ ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں بھی دخیل نہیں ہوئے انہیں ہندو عقائید پر بھروسہ تھا اپنے رویہ سے کسی ہندو کے مذہبی عقائد کو ٹھیس پہچانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ آپ کے دور میں ایک کمندان جھام سنگھ تھے جن کے تحت گھوڑ سوار فوجی دستے تھے۔ جھام سنگھ کو عربستان سے گھوڑوں کی خریداری اور نگہداشت سونپی گئی تھی۔ اس کام کی انجام دہی کے لئے ایک بڑی رقم آپ کی تحویل میں دی گئی تھی۔ جھام سنگھ نے سرکاری رقم سے ایک بالا جی کے مندر کی تعمیر کروائی جو آج بھی مندر جھام سنگھ کے نام سے مشہور ہے[۲۵]۔ اس مندر کے داخلے کے دروازے پر گھوڑوں کی مورتیاں نصب ہیں۔ سکندر جاہ کو جب اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے ناراض ہونے یا انہیں سزا دینے کی بجائے مندر کی تعمیر میں لگائی گئی رقم معاف کردی۔ جھام سنگھ کی نیت صاف تھی اس نے اگرچہ کہ سرکاری رقم کا

استعمال کیا تھا لیکن یہ رقم اس نے اپنے ذاتی عیش وطرب کے لئے استعمال نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی غلط کاموں میں اس کا استعمال ہوا تھا۔ جھام سنگھ نے سرکاری رقم کو اچھے مقصد اور نیک ارادے سے استعمال کیا تھا۔ سکندر جاہ نے اپنی فراخ دلی اور وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے رواداری کی روایت کو دہرا دیا[۲۶]۔ افضل الدولہ اور ناصر الدولہ بڑے سخی اور غربا پرور تھے۔ ہمیشہ حاجت مندوں کی ضروریات پوری کر دیتے۔ افضل الدولہ اتنے غربا پرور تھے کہ جب بھی ضرورمند کو دیتے تو ایک لاکھ سے کم روپیہ سرفراز نہیں فرماتے تھے۔ محل کے مصاحب اور خدام یہ سوچتے تھے کہ بادشاہ کو یا تو پیسے کی قدر نہیں یا پھر انہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہے کہ ایک لاکھ روپیہ کتنا ہوتا ہے۔ اتفاقاً آصف جاہ خامس نے ایک حاجت مند کو ایک لاکھ روپیہ دینے کا حکم دیا۔ مصاحبین نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک لاکھ روپیہ کا ڈھیر حضور پرنور کے آنے کے راستہ میں ڈال دیا۔ افضل الدولہ کے دورِ حکومت میں سکہ رائج الوقت چاندی کا تھا نوٹوں کا چلن نہیں تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ محل سے اتنی بھاری رقم کی ادائیگی خیرات کی صورت میں دینے کا جو رواج ہے اس کو ختم کیا جائے۔ جب افضل الدولہ کا گذر ادھر سے ہوا تو روپیوں کا ڈھیر دیکھ کر آپ نے دریافت کیا کہ یہ روپے کیسے ہیں۔ خادموں نے دست بستہ عرض کیا کہ آپ نے فلاں شخص کو ایک لاکھ روپیہ دینے کا حکم فرمایا تھا۔ یہ ڈھیر انہیں سکوں کا ہے۔ افضل الدولہ نے اس ڈھیر کو دیکھ کر بڑی حیرت سے فرمایا کہ ایک لاکھ روپیہ اتنے تھوڑے ہیں انہیں دو لاکھ کر دو[۲۷]۔ داد و دہش میں افضل الدولہ کا ثانی نہیں تھا۔ اپنی فراخ دلی کا ثبوت دے کر آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ شاہی روایات صرف دکھاوا یا تماشے کی غرض سے نہیں ہوتیں بلکہ ان میں صداقت اور سچائی کارفرما ہوتی ہے۔ میر محبوب علی خاں نے اپنے

دورحکومت میں ایسی ان گنت روایتیں قائم کیں ہیں کہ ان کومختصر سے بیان میں قلمبند کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔ مملکتِ آصفیہ حیدرآباد دکن کی عظمت اور اہمیت، خاندان آصفیہ کی درخشندہ روایات کے آخری فرمانروا میرعثمان علی خاں کی فیاضی، داد و دہش، آپ کی ملی اور علمی خدمات، تدبر و سیاسی بصیرت کے سب ہی معترف تھے۔ بمبئی کرانیکل نے لکھا تھا کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے ورنگل کے ایک علاقہ میں ہندو مسلم تنازعہ کا فیصلہ بہت عمدہ اور قابلِ ستائش طریقہ سے دیا۔ یہ تنازعہ ایک مسجد کی تعمیر کو لے کر تھا۔ حضور پرنور نے دو مسلمان اور ایک ہندو پر مشتمل مجلس مقرر کی تاکہ وہ معاملہ کی تحقیق کرے۔ مجلس کی رپورٹ ہندوؤں کے حق میں تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق آپ نے جو فرمان جاری کیا وہ آصف جاہی خاندان کی درخشندہ روایات کے مطابق تھا۔ ''ہم ہندو مسلمان برطانوی ہند میں کیوں نہ ان راہوں پر چلیں اور کیوں نہ اس طریقہ سے اپنے اختلاف کا فیصلہ طلب کریں جو ریاست نظام میں اس قدر کامیاب ہوئے[۲۸]۔

بادشاہ کا طرزِ عمل، نظریات، پسند ناپسند اور ان کے رویہ کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ تمام رعایا پر پڑتا ہے۔ شاہی دربار کے طور طریقے، آدابِ محفل کے دیرپا اثرات مرتب ہوا کرتے ہیں۔ انہیں گہرے اثرات سے متاثر ہوکر حیدرآبادیوں نے قدیم آدابِ معاشرت کو ترجیح دی۔ حیدرآبادی چاہے کسی بھی مذہب اور طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں اپنی تہذیب و شائستگی کی وجہ سے کسی بھی مقام پر بہ آسانی پہچان لئے جاتے ہیں۔ حیدرآباد کے آداب نشست و برخاست اور شاہی طور طریقوں میں اسلامی اور ہندو آداب کے اثرات مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں۔ بزرگوں، بڑوں اور لائق احترام ہستیوں کا ادب، والدین، استاد، سادھو سنت، مرشد، علماء، بڑے اور

ہم رتبہ لوگوں کی قدر و منزلت کی تعلیم سبھی مذہبوں نے دی ہے۔

جس طرح اسلام میں بزرگوں و بڑوں کی تعلیم واجب ہے، ہندو مذہب بھی سماجی رتبوں کے لحاظ سے آداب و تعظیم کا پابند ہے۔ ہندوؤں میں بھی راجہ، مہاراجاؤں، بزرگ خاندان، ماں باپ، بڑے بھائی بہن، شوہر، بڑے اور معزز لوگ، حاکم، مذہبی پیشوا، استاد اور محسن کی تعظیم و تکریم لازم قرار دی گئی ہے۔ اظہار ادب کے لئے بڑوں کے آگے سر جھکانا اور پیروں کو چھونے کی روایت بھی ہے۔

حیدرآباد میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے تھے اور ان میں اتنا میل ملاپ بڑھ گیا تھا کہ ان میں تمیز کرنا دشوار تھا۔ دونوں قوموں نے نہ صرف مسلمہ عقائد، عبادت کے طریقوں اور مذہبی اصولوں کے اثرات کو قبول کیا ہے بلکہ دونوں مذاہب کی اخلاقی تعلیمات نے ان کو متاثر کیا ہے۔ ان سے قطع نظر سیاسی اور درباری طور طریقوں کو اپنانے کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حیدرآبادیوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت عمدہ آداب معاشرت کا انتخاب کیا ہے۔ جس کا اثر ان کی روزمرہ کی زندگی پر نمایاں ہونے لگا تھا۔ بتدریج یہ اثر اتنا غالب رہا کہ حیدرآبادی تہذیب کے مظاہرے میں آداب، نشست و برخاست کو اولین مقام حاصل رہا ہے۔ حیدرآباد میں چاہے ہندو ہوں یا مسلمان، امیر ہوں یا غریب، ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ ان عمدہ روایات کے علمبردار نظر آتے ہیں۔

بڑوں کا احترام، بزرگوں کا ادب، چھوٹے بڑوں کی عزت، وشفقت، مہمانوں کا استقبال و پیشوائی، مصافحہ معانقہ، مہمانوں کے رتبہ کے مناسبت سے انہیں لے کر بیٹھنا، مزاج پُرسی، مہمان کی خاطر و تواضع میں کسر نہ رکھنا۔ ان تمام خصوصیات نے حیدرآبادیوں کو ان کی معاشرتی و تہذیبی زندگی میں بلند مقام عطا کیا ہے۔[29]

دونوں فرقوں میں خواتین کی بھی ویسی ہی تکریم اور پیشوائی ہوتی تھی۔ مردوں کی طرح عورتوں پر بھی بزرگوں کے آگے سر ڈھانکنا، ادب اور انہماک سے ان کی باتیں سننا، بیچ میں کاٹنے یا دخل اندازی کرنے، اونچی آواز میں گفتگو کرنا، زور سے نہ ہنسنا اور پردہ کی پابندی لازم تھی۔ جوان لڑکیوں کی نشست علیحدہ ہوتی تھی، انہیں بڑوں کی محفلوں میں بیٹھنے اور دوران گفتگو دخل اندازی کی اجازت نہیں تھی۔

والدین کے سامنے عروس ونوشہ باہم بات چیت نہیں کرتے تھے۔ بڑوں کے سامنے اپنے بچوں کو گود میں لینا یا پیار کرنا بے شرمی سمجھی جاتی تھی۔ جھوٹ اور ایسی باتوں سے پرہیز کرتے جو گناہ کے دائرہ میں آتی تھیں۔ دوسروں کی شکایت کرنا یا سننا کسی کو نیچا گرانا، ہنسی اڑانا، دوسروں کی برائی کرنا یہ تمام عادتیں برائی کے دائرہ میں آتی تھیں ان سے گریز کرنے اور ان سے دور رہنے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے کیونکہ قدیم لوگ مذہبی، عبادت گذار اور نیک بندے تھے[۳۰]۔

دنیا میں مختلف علاقوں اور قوموں میں سلام کرنے کے الگ الگ طریقے مروج ہیں۔ لیکن حیدرآبادی سلام خاص نوعیت کے اعتبار سے بے حد مشہور ہے۔ حیدرآبادی تہذیب کی انفرادیت میں اس کا مخصوص طریقہ سلام ہے۔ اصل میں حیدرآبادی سلام ایرانی یعنی قطب شاہی سلاطین اور دہلی دربار یعنی مغلیہ تہذیب و تمدن کی یادگار ہے۔

آصف جاہی روایت کے مطابق بادشاہ وقت کے دربار میں حاضر ہوتے ہی خمیدہ ہوکر ہاتھ کو نیچے اوپر لیجا کر سات، نو یا گیارہ مرتبہ سلام کیا جاتا تھا۔ امراء اور جاگیرداروں میں بھی یہی طریقہ مروج تھا۔ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی تو خاص انداز سے خفیف سا خم ہوکر ہاتھ کو دو تین بار پیشانی تک حرکت دے کر سلام کیا

جاتا تھا۔گھر میں چھوٹے بھی جھک کر بڑوں کوسلام پیش کرتے تھے۔گھر کے ملازمین اورخدام بھی آداب کے پابند ہوا کرتے تھےاوراپنے مالک کو جھک کرسلام بجالاتے تھے۔گھر کی بہوئیں بھی اس رواج کی پابند تھیں۔عیدوتہوار شادی بیاہ کی تقاریب اور دوسرے خوشی کے موقعوں پرسلام کرنے کا انداز الگ ڈھنگ سے ہوا کرتا تھا۔اس طریقہ میں چھوٹوں کو لازم تھا کہ بزرگوں کے قریب آ کرسلام کرتے ہوئے اپنی گردن جھکا کرسر کو پیٹ سے لگائیں۔ جو حیدرآباد میں ''پیٹ میں منڈی ڈالنا'' کہلاتا تھا۔اس طرح کے سلام میں بڑوں کوواجب تھا کہ سر پر ہاتھ رکھ کردعادیں اور عورتیں بلائیں لے کردعائیں دیتی تھیں۔

حیدرآباد میں سلام مختلف ڈھنگ سے کیا جاتا تھا جیسے آداب عرض، بندگی،قدم بوسی،تسلیمات یاصرف آداب۔

ہندو نمستے،نمسکار،ڈنڈوت،رام رام،جے رام جی کہتے تھے۔ان کے علاوہ کائستھوں میں آداب کا طریقہ بھی رائج تھا۔

ہندو اور مسلمانوں کو مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل تھی ۔ مذہبی رواداری کی پالیسی نے ہندواور مسلمانوں میں اعتماد بڑھایا اوروہ ایک دوسرے سے اورقریب آ گئے۔آصف جاہی دور کی روایت کے مطابق ہندو عالم،رہنما،پنڈتوں اور پجاریوں کو نہ صرف اعزازات سے نوازا جاتا تھا بلکہ امدادواعانت بھی جاری تھی۔ چھوٹے بڑے منادراور مذہبی اداروں کو مالی امداد دی جاتی تھی حکومت کی جانب سے مندروں کی دیکھ بھال کے لئے انعام اور جاگیریں عطا کی جاتی تھیں۔آخری حکمران میر عثمان علی خاں نے مہابھارت کی اشاعت کے لئے پونا کے بھنڈارکر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کوسالانہ مالی امداد دی تھی۔ جو دس سال تک جاری تھی اور

بعدازاں مزید جاری رکھنے کے لئے فرمان نکالا تھا[۳۱]۔

آصف جاہی فرمانرواؤں نے کبھی اپنے پیشروؤں کی قائم کردہ روایات سے تجاوز نہیں کیا۔ ہندواور مسلم تہوارات پردربار منعقد کرنا، دیوالی کو دھن لکشمی کی پوجا کرنا[۳۲] ہولی کے رنگوں میں رنگنااور بسنت کو بسنتی جوڑے پہننا معمول تھا۔امراء سلطنت جاگیرو منصب دار بغیر کسی بھید بھاؤ کے ہوئی، بسنت اور تلسنکرات مناتے تھے۔

حیدرآبادی روایات مختلف مذاہب کے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں بڑی حدتک کامیاب رہیں۔ دیوالی اور شب برات کے موقع پر ایک دوسرے کو آتش بازی بھیجنا، خاص اہم تہوار جیسے بقیر عید، ہولی، دیوالی اور دسہرہ پر رشتہ داروں، دوست واحباب، پڑوسی اور نوکر چاکر میں مٹھائی کی تقسیم اسی طرح آم کے موسم میں آم بھیجنے کی روایت برسوں سے جاری ہے[۳۳]۔

ہم نے دیکھا کہ مذہبی تہوار نہ صرف بھائی چارگی اور میل ملاپ کو بڑھاوادیتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے مذہب میں عقیدہ اور احترام کا بھی سبق دیتے ہیں۔ آصف جاہی دور میں ایسی کئی مثالیں ملیں گی جہاں آج بھی ہندو مسلم یکجہتی اور ایک دوسرے کے مذہب کا احترام اور عقیدت کے مظاہرے دیکھنے کوملیں گے۔تمدنوں کا سنگم حیدرآباد میں ہرسال محرم کو بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔محرم صرف جاگیردار طبقہ اور امراء ہی نہیں مناتے تھے بلکہ ان تقاریب میں بلاتخصیص ہندو بھی حصہ لیتے تھے۔محرم کے تقاریب میں حصہ لینے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں ہندو دیہاتوں سے آکر بڑی عقیدت اور جوش وخروش سے محرم کے اجتماع میں شامل ہوجاتے تھے[۳۴]۔

آصف جاہ اول کے عہد حکومت سے ہی عاشور خانے میں زیارت کے لیے

سجے ہوئے ہاتھی پر رونق افروز میر محبوب علی خاں

جلوس بہ موقع عرس مولا علی

جانے اور مجلس میں شرکت کی روایت قائم ہو چکی تھی۔ جس کی پابندی آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کے دور تک جاری رہی۔ محرم کی دسویں تاریخ کو صبح گیارہ بجے غریبوں میں روٹ اور شربت تقسیم کیا جاتا تھا۔ آصف جاہ سادس کے دور میں عشرہ اول میں روزانہ چالیس سیر کی کھچڑی عاشور خانے میں غریبوں میں تقسیم ہوتی تھی۔ ۸ر محرم کو بریانی کھلائی جاتی تھی۔ لیکن میر عثمان علی خاں کی وفات کے ساتھ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا[۳۵]۔ غریبوں کو کھانا کھلانے کا بھی رواج تھا۔ جو خاص طور پر خاندان میں میت ہونے پر ہوتا تھا۔ درگاہوں، پیر و مرشد کی مزاروں وغیرہ بارہ وفات اور گیارہویں پر نیاز کی روایت میر محبوب علی خاں کے دور تک جاری رہی[۳۶]۔ ہندوؤں میں بھی غریبوں کو کھانا کھلانے کا طریقہ رائج تھا۔ ہندو بھی بڑی عقیدت سے نیاز کرواتے تھے۔ آج بھی میرے خاندان کے افراد محبوب سبحانی کی نیاز کراتے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں ہندو بھی مسلمانوں کی طرح افطار کی دعوت کیا کرتے تھے۔

درویشوں اور سادھو سنتوں کے پاس حاضری دینے کا رواج آصف جاہی دور سے جاری تھا۔ ہندو اور مسلمان پابندی سے ان کے آستانے پر سر جھکاتے تھے۔ اولیاء کی درگاہوں پر ہندو بڑی تعداد میں جاتے اور عرس کی تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ چنانچہ پہاڑی شریف اور مولا علیٰ کے عرسوں میں ہندو بڑی تعداد میں شرکت کرتے تھے۔ اسی طرح مسلمان بھی بڑی عقیدت سے سادھو سنتوں کی خدمت میں حاضر رہتے اور بہ موقع جاترا اور میلے میں بڑی تعداد میں حصہ لیتے۔ اس کی عمدہ مثال کیشو گری کی جاترا ہے جہاں مسلمان امراء اور معززین کے علاوہ بڑی تعداد میں مسلم بھائی شریک ہوتے تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کی اولیاء اور سادھو سنتوں سے عقیدت اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام الناس پر سادھوؤں اور صوفیوں کی تعلیمات کا
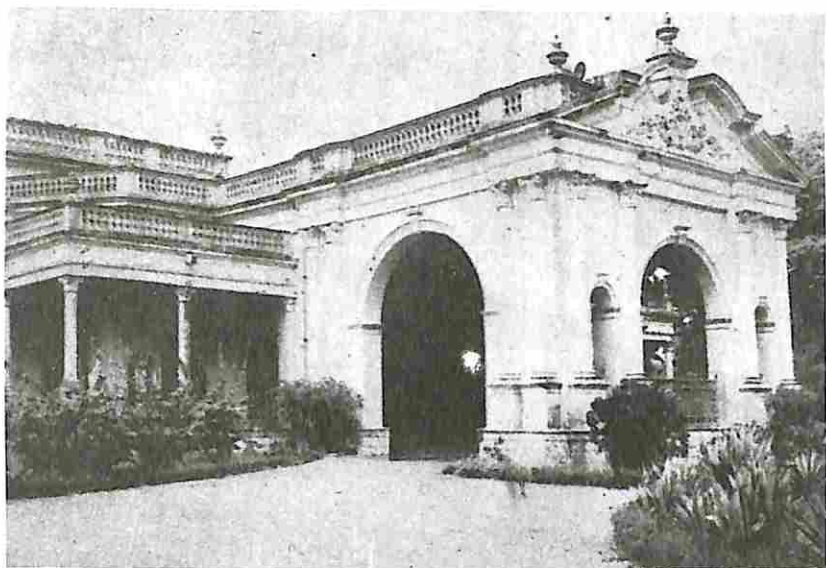
مسرت محل

پرانی حویلی

گہرا اثر تھا۔ کیونکہ ان لوگوں نے اپنی سیدھی سادی تعلیمات سے مل جل کر رہنے کی ترغیب دی تھی۔

اپنے ایک مضمون ''ہندوستان کا ثقافتی اتحاد اور حیدرآباد کا مقام'' میں جناب بی رام کرشنا راؤ نے لکھا ہے ''حضرت خواجہ بندہ نواز کے عرس شریف کا آغاز ایک مقامی ہندو فقیر کی سمادھی پر ندا لگانے کے بعد وہاں سے جو تحفتاً تیل اور گڑ آتا تھا اس کو درگاہ پر چڑھانے کے بعد ہوتا تھا[۳۷]۔ پڑھنے اور سننے میں تو یہ روایت بے کار اور بے معنیٰ لگے گی لیکن اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں تو پتہ چلے گا کہ یہ روایت جو ہندوستان کی ایک بہت بڑے اولیاء کی درگاہ سے جڑی ہے وہ لوگوں کو عقیدت اور یکجہتی کا پیغام دیتی ہے۔

محلوں کا شہر حیدرآباد فن تعمیر میں بے نظیر تھا۔ آصف جاہی دور کے عروج سے لے کر اختتام تک جتنی بھی عمارتیں تیار ہوئیں اس کا طرز تعمیر مشترکہ تہذیب وشائستگی، انسان دوستی، رواداری، بلند معیار، حسین تخئیل اور نفاست پسندانہ مزاج کی آئینہ دار ہیں۔ آصف جاہی دور کی تعمیر کردہ عمارتوں میں قابل ذکر پرانی حویلی، مسرت محل (واقع پرانی حویلی) خلوت مبارک، منجھلی بیگم کی حویلی، رکن الدولہ کا بم، توپ کا سانچہ اور بیسویں صدی میں بننے والی ہائی کورٹ، عدن باغ، دواخانہ عثمانیہ، ٹاؤن ہال، جوبلی ہال، شفا خانہ چارمینار، کتب خانہ آصفیہ، عثمانیہ یونی ورسٹی، سٹی کالج، جودی مسجد، اور دوسری کئی عمارتیں آصفجاہیوں کے ذوق سلیم کا مظہر ہیں، اور بلاشبہ ہمارا مشترکہ تہذیبی ورثہ۔ ان ساری عمارتوں میں ہندو مسلم اور مغربی طرز تعمیر کا امتزاج جھلکتا ہے[۳۸]۔ تعمیرات کے سلسلہ میں دیکھا جائے تو آصف جاہ سابع کا دور مغلیہ سلطنت کی دورِ شاہ جہانی سے مماثلت رکھتا ہے

امرائے سلطنت کی ڈیوڑھیاں جیسے خورشید جاہ کی ڈیوڑھی، بارہ دری، چندو لال، رائے رایاں کی ڈیوڑھی، آسمان گڈھ، بشیر باغ پیلس، ارمِ منزل، فلک نما پیلس، مال والوں کی ڈیوڑھی، اقبال الدولہ کی ڈیوڑھی، اور کنگ کوٹھی وغیرہ فن تعمیر کے ایسے نمونے ہیں جن کا کوئی ثانی نہیں۔ یہ عالی شان عمارتیں نہ صرف امراء اور روساء کے ذوق سلیم اور نفاست پسندی کی ترجمان ہیں بلکہ یہ عظیم الشان عمارتیں قرونِ وسطیٰ کی ایسی بے مثال یادگار ہیں جو ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی کے گہرے نقوش واضح کرتی ہیں [۳۹]۔

ہندو امراء اور جاگیردار کی ڈیوڑھیوں اور روساء اور نوابوں کی حویلیوں کے طرز تعمیر میں بھی کافی یکسانیت تھی۔ ان میں سے کئی تو اب باقی نہیں رہیں لیکن ان کی بناوٹ، سجاوٹ ہر چیز سے روایتی تہذیب وشائستگی ٹپکتی ہے [۴۰]۔

حیدرآباد کی رواداری انہ فضاء کی برقراری میں زبان کے کردار کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ فارسی کی طرح اردو ادب کی تشکیل اور اس کے فروغ میں ہندو اور مسلمان دونوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا [۴۱]۔ حالانکہ ہندوؤں کی مادری زبان ہندی ہے لیکن اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ برسوں تک ساتھ رہنے کی وجہ سے انہوں نے اردو زبان کو زیادہ ترجیح دی اور اردو زبان میں طبع آزمائی کی۔ دکن میں اردو زبان کو آج جو مقام حاصل ہے وہ ہندوؤں کی حصہ داری اور شمولیت کے بغیر ناممکن تھا۔ اپنی رواداری کی روایت کو جاری رکھتے ہوئے آصف جاہی فرمانروا خاص کر آصف جاہ سادس اور آصف جاہ سابع نے اردو زبان کی تشکیل اور فروغ میں مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کی بھی دل کھول کر سرپرستی کی۔ زبان کسی ایک مذہب کی ملکیت نہیں۔ آزاد ہندوستان میں اگر آصفی روایات کی عمل آوری پابندی

سے ہوگی تو اردو زبان سب قوموں کو مضبوط اور ایک رشتہ میں باندھنے میں ضرور کامیاب رہے گی۔

آصف جاہی دور میں فرمانرواؤں نے اپنے اپنے رویہ سے اپنی رعایا کو نہ صرف اپنے سے قریب رکھا بلکہ ہندو اور مسلمانوں کو بھی ایک دوسرے سے اتنا قریب لا دیا کہ دونوں قومیں زندگی کے ہر پہلو میں ایک دوسرے سے جڑ گئیں۔ کسی تیسرے آدمی کے لئے ان دونوں قوموں کی شناخت مشکل ہی نہیں ناممکن تھی۔ قربت نے دونوں کے رشتہ بہت استوار اور مضبوط کر دیئے تھے۔ حقیقتاً وہ غیر نہیں بھائی بھائی تھے۔ ان کے آپسی میل ملاپ، پیار و محبت اور جذبۂ اخلاص سے متاثر ہو کر راجہ نرسنگھ راج عالیؔ نے یہ رباعی قلمبند کی تھی کہ ؎

اہل دنیا بگڑتے جاتے ہیں
ہندو مسلم کے گہرے ناطے ہیں
سب برادر ہیں غیر عالیؔ کون
یہ بزرگوں سے سنتے آئے ہیں

آصف جاہی حکمرانوں نے اپنے دوسوسالہ دور حکومت میں یہ ثابت کر دیا کہ حیدرآباد میں ہندو اور مسلمانوں کی تہذیب، ثقافت و شائستگی، آئین و نظم حکومت کی ساری صفات اور مغلیہ جاہ و جلال، شان و شوکت، دولت و امارت کی ساری روایات موجود ہیں۔ روایات کا شہر حیدرآباد ملنساری، رواداری اور محبت کی یادگار ہے۔ شاید اسی محبت اور رواداری کا کرشمہ ہے کہ اس شہر کا امن فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا نمونہ رہا۔ اپنی اسی مشترکہ تہذیب اور طرز معاشرت کی وجہ سے حیدرآباد شہر چار دانگ عالم میں مشہور اور سربلند رہا۔ اس کی رواداری بے نظیر ہے اور روایات

درخشندہ ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ اس شہر میں ایسا کچھ نہ ہو جس سے برسوں سے کھڑی رواداری اور روایات کی یہ عمارت ڈہ جائے۔ اس شہر کی تہذیب و شائستگی اور درخشندہ روایات کے وارث حیدرآبادی ہیں۔ شاہانِ آصفی اور ہندو مسلمانوں کی دوسو سالہ قدیم روایات ہمارا قومی ورثہ ہیں ان کو برقرار رکھنا اور ان پر عمل کرنا ہر حیدرآبادی کا اولین فرض ہے۔

حوالہ جات

۱۔ لالہ منسارام۔ ضوابط حضور پرنور (فارسی) ۱۷۶۲ء۔ ص ۱۱۔ ص ۴۵۔

۲۔ ڈاکٹر شیلا راج Portrait of on era, Hyderabad in the days of the Nizams، منروا پریس۔ لندن۔ ۱۹۹۶ء۔ ص ۳۱۔ ۳۳۔

۳۔ Imperial Gazettees of India, Provincial series, ۔ حیدرآباد۔ کلکتہ۔ سپرنٹنڈنٹ گورنمنٹ پرنٹنگ۔ ۱۹۰۲ء۔ ص ۲۶۔

۴۔ لالہ منسارام۔ بحوالہ بالا، ص۔ ۹۔ ۱۰

۵۔ لالہ منسارام۔ معاصر نظامی۔ فارسی، قلمی مسودہ ص ۹۶۔ ۹۷ سیتو مادھو راؤ پگڑی۔ معاصر نظامی۔ انگریزی ٹرانسلیشن۔

۶۔ دلاور علی دانش۔ ریاض مختاریہ، اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد۔ ۱۹۴۲ء۔ ص ۱۶۴۔ ۱۶۹۔

۷۔ ہارون خاں شیروانی۔ تمدنوں کا سنگم حیدرآباد۔ مطبوعہ روزنامہ سیاست، ۱۹۷۸ء۔ ص ۱۵

۸۔ دلاور علی دانش۔ بحوالہ بالا۔ ص۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔

۹۔ راجہ نرسنگھ راج عالی۔ درد باقی و درد باقی۔ حیدرآباد۔ سردار پریس۔ ۱۹۲۳۔ ص ۳۵۔

١٠۔ مملکت آصفیہ۔محبانِ دکن۔کراچی۔۱۹۷۸ء۔ص۔۳۴۰

١١۔ نصیرالدین ہاشمی۔دکنی کلچر۔لاہور۔عالیہ پرنٹرس ۱۹۶۳۔ص ۲۸۵

١٢۔ نصیرالدین ہاشمی۔بحوالہ بالا۔ص۔۲۹۶

١٣۔ Chronology of Modern Hyderabad۔سنٹرل ریکارڈ آفس،حیدرآباد،۱۹۵۴ء۔ص ۱۱۹۔

١۴۔ عزیز جنگ۔تاریخ النوایط۔عزیز المطابع۔حیدرآباد۔۱۹۰۷ء۔ص۔۱۲۴

١۵۔ نصیرالدین ہاشمی،بحوالہ بالا۔ص۔۲۹۹۔

١٦۔ حیدرآباد کے قصہ، کہانیاں اور روایات ، مطبوعات روزنامہ سیاست ، حیدرآباد،۱۹۹۴ء ص۔۴۔۵

١٧۔ نصیرالدین ہاشمی،بحوالا بالا۔ص ۲۲۶۔۲۲۷۔

١٨۔ The Days of the Beloved - Lynton and M.Rajan یونیورسٹی آف کیلی فورنیہ۔برکلے۔۱۹۷۴ء۔ص۔۶۱۔۶۲

١٩۔ ہارون خاں شیروانی۔دکنی کلچر۔انجمن اسلام اردو ریسرچ سنٹر۔حیدرآباد۔ ص۔۵۲

٢٠۔ نصراللہ خاں۔تاریخ دکن۔نول کشور پریس۔لکھنؤ۔۱۸۶۵ء۔ص ۱۲۶

٢١۔ ہارون خاں شیروانی۔بحوالہ بالا۔ص۔۵۳۔

٢٢۔ مانک راؤ وٹھل راؤ ۔ بوستان آصفیہ ، حصّہ دوم ۔ انوارالسلام پریس ۔ حیدرآباد۔ ۱۹۰۹ء۔ص۔۶۲۵

٢٣۔ عزیز جنگ۔بحوالہ بالاص۔۱۰۰۔۱۰۱

٢٤۔ حیدرآباد کے قصہ،کہانیاں اور روایات،بحوالہ بالا۔ص۔۲۴

٢٥۔ حیدرآباد کی مشہور عبادت گاہیں۔درگاہیں اور مذہبی عمارتیں۔ص۔۱۹۔

٢٦۔ حیدرآباد کی مشہور عبادت گاہیں۔ص۔۱۹

٢٧۔ حیدرآباد کے قصہ کہانیاں۔بحوالہ بالا۔ص۔۵

۲۸۔ مملکت آصفیہ۔ جلد دوم۔ بحوالہ بالا۔ ص۔ ۵۲۸
۲۹۔ ڈاکٹر حمید الدین شرفی۔ تاریخ شہر حیدرآباد۔ مطبوعہ سیاست۔ حیدرآباد۔ ۱۹۹۴۔ ص ۷۲
۳۰۔ بحوالہ بالا۔ ص۔ ۷۳
۳۱۔ ڈاکٹر سید داؤد اشرف۔ حاصلِ تحقیق۔ شگوفہ پبلیکیشنز۔ حیدرآباد۔ ۱۹۹۲ء۔ ص۔ ۸۰
۳۲۔ روزنامہ مشیرِ دکن۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۳ء۔ حیدرآباد
۳۳۔ جیون یار جنگ۔ کارنامہ سروری۔ مطبوعہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی پریس، ۔ علی گڈھ۔ ۱۹۳۳ء۔ ص ۱۳۶۔ ۱۳۷
۳۴۔ ویدانتم۔ ٹی A Monograph on Muharram in Hyderabad Census of India۔ ۱۹۷۷ء ص۔ ۲۰
۳۵۔ راحت عزمی۔ حیدرآباد کا محرم، روزنامہ سیاست، حیدرآباد، ۲۱ دسمبر ۱۹۷۷ء ص۔ ۲۰
۳۶۔ Lynton, M.Rajan۔ بحوالہ بالا۔ ص ۷۱۔ ۷۲
۳۷۔ بی رام کرشنا راؤ۔ ہندوستان کا ثقافتی اتحاد اور حیدرآباد کا مقام۔ سیاست پبلیکیشنز۔ حیدرآباد۔ ۱۹۷۸ء۔ ص۔ ۱۱۷
۳۸۔ ڈاکٹر حمید الدین شرفی۔ بحوالہ بالا۔ ص۔ ۷۰
۳۹۔ ڈاکٹر حمید الدین شرفی۔ بحوالہ بالا۔ ص۔ ۷۰
۴۰۔ مملکت آصفیہ۔ بحوالہ بالا۔ ص۔ ۳۳۴
۴۱۔ رام بابو سکسینہ۔ تاریخ اردو ادب۔ رام نارائن لال۔ الہ آباد۔ ۱۹۲۷ء ص ۱۸۱۔

ڈاکٹر شیلا راج نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے اُردو اور تاریخ میں ماسٹرس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد تعلیم میں بھی ڈگری حاصل کی۔ اُنھوں نے شریمتی ناتھی بائی دامودر ٹھاکرسی ویمنس یونیورسٹی بمبئی سے تاریخ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ آپ کو تاریخ میں ڈاکٹر (شریمتی) پریم لیلا ٹھاکرسی ایوارڈ بھی دیا گیا۔

ان کا ریسرچ انیسویں اور بیسویں صدی کے حیدرآباد سے متعلق ہے۔ انھوں نے آصف جاہی دورِ حکومت میں سماجی، معاشی، تہذیبی اور عام انتظامات کے بارے میں قابل قدر تحقیق کی ہے، جن کی جھلک آپ کے لکھے ہوئے ۲۸ مقالوں میں ملتی ہے جو ادبی رسالوں اور اُردو اور انگریزی اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر شیلا کی کتاب "عہد وسطیٰ کے رجحانات سے عصری رجحانات تک" Mediaevalism to Modernism میں ۱۸۶۹-۱۹۱۱ء تک جو سماجی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیاں ہوئیں اُن کا ذکر ملے گا۔ انھوں نے راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقیؔ عرف بنسی راجہ کے دو قلمی مخطوطات کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کر کے طبع کروایا ہے جن کے نام "توشہ عاقبت" اور "شاہی شادی" ہیں۔

ان کے علاوہ لندن میں ۱۹۹۶ء میں شائع ہونے والی ان کی کتاب "ایک عہد کا مرقع" Portrait of an Era میں نظام کے دربار اور طبقہ اشراف کی جھلک پیش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں یہ خاص طور پر واضح کیا گیا ہے کہ انیسویں صدی کا حیدرآباد ہندو مسلم اتحاد اور رواداری کی ایک روشن مثال تھا۔ اس بات کو ذہن نشین رکھتے ہوئے حیدرآبادیوں کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تہذیب اور رواداری قومی یکجہتی کے مستحکم ترین ستون ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر شیلا نے "مملکتِ آصفیہ" کی دونوں جلدوں کا ترجمہ اُردو سے انگریزی میں کیا ہے، اس کتاب کو نظامس اُردو ٹرسٹ حیدرآباد نے The Legacy of the Nizams کے نام سے شائع کیا ہے۔

اُردو ادب اور شعر و شاعری کے ذوق نے انھیں راجہ محبوب راج محبوبؔ کے کلام کو منظر عام پر لانے کی طرف متوجہ کیا جو برسوں سے بیاضوں میں بند پڑا تھا۔ ڈاکٹر شیلا نے محبوب راج محبوب کے کلام کو مرتب کیا اور "دیوان محبوب" کے نام سے گرہری پرشاد چیاریٹبل ٹرسٹ کے زیر اہتمام شائع کیا ہے۔